ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

ستمبر ۲۰۱۹ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۳ | محرم الحرام ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ: 25:00 روپے
سالانہ: 250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ: 500:00 روپے
بیرونی ممالک: 30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال): 4000:00 روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation
Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	قرآن کی رہنمائی	محمد رضی الاسلام ندوی	
۲۔	اداریہ	ایک اجتماعی مرض	مدیر	۳
۳۔	خاص تحریر	سید سلیمان ندوی مرحوم (۱۳۰۲ھ-۱۳۷۳ھ)	مولانا مسعود عالم ندویؒ	۶
۴۔	تاریخ کے جھروکوں	''اسلام میں مذہبی رواداری''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۱۵
۵۔	فکر و نظر	راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۲۷
۶۔	اصلاحیات	مسلمانوں کی پانچ بیماریاں	مولانا سید احمد ومیض ندوی	۳۰
۷۔	//	شخصی روابط تربیت کا لازمی حصہ	ابو متین	۳۴
۸۔	//	آزادی کے نام پر	زین العابدین ندوی	۳۷
۹۔	فقہیات	خواتین کا حق	مولانا حافظ کلیم اللہ عمری ندوی	۳۹
۱۰۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۰
۱۱۔	بحث و تحقیق	قوموں کے عروج و زوال	عبدالرشید طلحہ نعمانی	۶۰
۱۲۔	شعر و ادب	قطعۂ تاریخ وفات	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

ایک اجتماعی مرض

حفیظ میرٹھی مرحوم کا ایک معنیٰ خیز شعر نظر سے گذرا۔

بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

واقعہ یہ ہے کہ معاشرہ پر نظر ڈالیے تو ہر عام و خاص اور مثقف و غیر مثقف اسی تگ و دو میں مبتلا ہے، اچھا مکان، اونچی عمارت، نام ونمود اور نمائش، بڑا بینر، بڑا نام، بڑی شخصیت، مناصب کی لالچ اور ان جیسی خواہشات نے وبائی مرض کی شکل اختیار کرلی ہے، خالص دنیادار آدمی ہے تو اس کی تگ و دو دنیاداری اور دنیا سازی تک محدود ہے، پڑھا لکھا آدمی ہے تو اس کی تگ و دو دوسروں کو نیچا دکھانے اور خود کو بڑا بنانے تک محدود ہے، ہماری قومی تنزلی کا ایک بڑا راز انفرادی سطح پر صلاح واصلاح کے احساس کا فقدان ہے، ہر شخص، ہر تنظیم، ہر ادارہ، ہر جماعت خود کو کامل سمجھنے کی زبانِ قال سے نہیں تو زبانِ حال سے دعویٰ کرتی ہے، عملاً بس ساری تگ و دو اپنی شناخت، اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے، جب پسِ پردہ مقاصد پست ہوتے ہیں تو پھر قدم قدم پر بے ضابطگی، بے اصولی، بے اعتدالی اور ناانصافی سرزد ہوتی ہے، صلاحیتیں قتل کی جاتی ہیں، افراد کو ذہنی مریض بنایا جاتا ہے، مناصب پر تسلط باقی رکھنے کے لیے ہر طرح کا حربہ اپنایا جاتا ہے، موروثیت کو باقی رکھنے کے لیے نااہلی کو بھی افضل الموجود کا سہارا لے کر اہلیت میں بدل دیا جاتا ہے، پھر اس وقت اس جیسی روایات بھی پیشِ نظر نہیں رہتیں، جمع الفوائد کی ایک روایت ہے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سونپی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی وتعلق کی بنا پر بغیر اہلیت معلوم کیے دے دیا، اس پر اللہ کی لعنت ہے، نہ اس کا فرض قبول ہے نہ نفل، یہاں تک کہ جہنم میں داخل ہوجائے''۔ حسد وغیبت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سب عادتیں اور کرتوتیں فرد، معاشرے، ادارے اور تنظیموں کی جڑیں کھوکھلی کرتی جاتی ہیں، زوال اپنے پیر پسارتا جاتا ہے اور انسان کو اندازہ بھی نہیں ہوتا، کیوں کہ اس نے پہلے ہی اپنے کو بڑا اور کامل ومکمل رہنما سمجھ لیا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ایام اللہ کی تفصیلات اور گردش زمانہ کے مشاہدات معاشروں کے لیے عبرت ہیں، دوسروں کو ان سے واقف کرانا ہماری ذمہ داری ہے، ان کا خطاب ہم سے کہاں؟

اس طرح کی نفسیات کا نتیجہ ہوتا ہے کہ انسان کو جو کچھ حاصل نہیں ہوتا وہ صبح وشام اسی کے حصول میں لگا رہتا ہے، مثلاً کسی کو اگر اللہ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے تو اس کا مدّ مقابل بس اسی کی حصول کے لیے حیران وسرگرداں، یہ الگ بات کہ اگر صلاحیتیں کسبی واختیاری ہیں تو ان کے حصول کی کوشش میں مضائقہ نہیں اور اگر وہبی ہیں تو پھر ساری کوشش رائیگاں، مگر رب کی طرف

سے دوسروں کو عطا کردہ خصوصیات، دوسروں پر انعامات کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہونا پھر اس کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں لگ جانا، زبردستی اس کو کمتر ثابت کرنے کے لیے اصولوں کا قتل کرنا، اِدھر کی اُدھر کرنا اور گھٹیا ترین مقاصد کے حصول کے لیے غیبت وتجسس میں مبتلا ہونا وغیرہ ایسے جرائم ہیں جو دن بدن اس امت کو، اس کے اداروں کو، اس کی تنظیموں کو کمزور کرتے جارہے ہیں، جب بھی اس سلسلہ میں کسی سے گفتگو کا اتفاق ہوا تو بس آہِ سرد کے ساتھ جواب ملتا ہے ''بھائی زوال تو ہر جگہ ہے''، سوال یہ ہے کہ جب زوال تسلیم ہے تو اس کے اسباب پر غور کیوں نہیں؟ اس کے علاج کی منصفانہ کوشش کیوں نہیں؟ کتاب اللہ کا نسخۂ عروج موجود ہونے کے باوجود اس سے اعراض کی کیا وجہ؟

اتفاق سے جس وقت حفیظ مرحوم کا یہ شعر نظر سے گذرا اسی وقت ہمارے درس میں سورہ نساء کی یہ آیت وارد ہوئی ولا تتمنوا ما فضل الله به بعضكم على بعض ..... (نساء۳۲) ''ان چیزوں کی حرص میں نہ پڑو جن میں اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایک صنف کو دوسری صنف کے مقابلہ میں کچھ زیادہ صلاحیتوں سے نوازا ہے''۔ یہ آیت اگرچہ آیات میراث کے بعد مردوں کے ان فضائل کے بیان میں وارد ہوئی ہے جو ان کو تکوینی طور پر قدرت نے عطا کیے، مگر اس کے لفظی عموم میں ایک بہت ہی اہم سبق پوشیدہ ہے، اس اہم اخلاقی نصیحت کو اگر حرزِ جاں بنالیا جائے تو ہماری معاشرتی واجتماعی زندگی صحیح ڈگر پر آجائے، بڑی حد تک حسد وکینہ اور غیبت میں کمی آجائے، تجسس اور ہیر پھیر اور سمّعون للكذب سمّعون لقومٍ اٰخرين (مائدہ۴۱) ''یہ سب جھوٹی باتوں پر خوب کان لگاتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی سُن گُن میں لگے رہتے ہیں''، کی منافقانہ روش ختم ہوجائے، اختلافات کا گراف نیچے آجائے اور اتحاد کی راہیں ہموار ہوجائیں، دلوں کی دوریاں قربتوں میں تبدیل ہوجائیں، نفرتیں، عداوتیں اور دشمنیاں محبتوں میں بدل جائیں، آیت کا ٹکڑا صاف بتارہا ہے کہ تمام انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے یکساں نہیں بنایا ہے، مختلف بلکہ لامحدود حیثیتوں سے ان میں فرق رکھا ہے، یہ فرق جسمانی بھی ہے اور ظاہری ومادی اور ذہنی وفکری بھی، یہ تمام فرق عین حکمت وفطرت کے مطابق ہیں، پوری انسانی آبادی کی عمارت ان ہی فرق وامتیازات پر قائم ہے، اس فرق کو مٹانے کی انسانی اور مصنوعی کوششیں دراصل سارے فساد کی جڑ ہیں، کیونکہ یہ دراصل فطرت کے خلاف جنگ ہوتی ہے، اس دنیا کی رنگا رنگی میں خوبصورت وبدصورت، ذہین وغبی، باصلاحیت وبے استعداد، باعزت ورذیل، صاحب مناصب وبے حیثیت سب کو رہنا ہے، امیری وغریبی دونوں حقیقت ہیں، کسی کا بہتر حال میں ہونا اور کسی کا بدحالی سے گذرنا یقینی ہے، اب اگر انسان اس فطری فرق کو مٹانے میں لگے گا تو فسادات رونما ہوں گے، وہ جس میدان میں ہوگا اس میدان میں اپنے سے آگے والے کو پیچھے کرنے میں لگ جائے گا، جو فضل اس کے مدمقابل کو حاصل ہوگا وہ اگر اسے نہ حاصل ہو اور اس کے حصول کے لیے جائز تدبیریں کام نہ آئیں تو ناجائز طریقوں کا استعمال کرے گا، اسی غلط رویّہ، غلط سوچ اور فطرت کے خلاف جنگ کے نتیجہ میں پھر رقابت وعداوت، اور مزاحمت وکشمکش اور اس سے آگے بڑھ کر ٹکراؤ اور اختلافات کی صورت حال پیدا ہوتی ہے جس سے ترقی کے راستے مسدود ہوجاتے ہیں اور زندگیاں تباہ ہوکر رہ جاتی ہیں، ادارے اور تنظیمیں قصۂ پارینہ بن جاتی ہیں، پھر لاشئہ بے جان کی طرح ''پدرم سلطان بود'' کے سہارے زندہ رہتی ہیں، اسی لیے اس آیت میں دوسروں کو جس فضل سے نوازا گیا اس کی تمنا سے منع کیا گیا اور یہ واضح کردیا گیا کہ ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا مل کر رہے گی، البتہ اس کی تعلیم دی گئی کہ مزید فضل کی دعا ہر ایک کو کرتے رہنا چاہیے، اللہ اپنے علم وحکمت کے سبب جس کو جو بہتر سمجھے گا عطا فرمادے گا۔

قرآن مجید نے بہ تقاضائے حکمت جو فرق رکھا اور جو کمالات وامتیازات لوگوں میں تقسیم کیے گئے، ان کے لیے بے جا تمنا

اور ناجائز تگ ودو کے طریقوں کا سدّ باب کرتے ہوئے یہ ہدایت دی کی ہر ایک کو اپنی قسمت پر نازاں وفرحاں رہنا چاہیے، تقدیر کے فیصلوں پر راضی برضا رہنا چاہیے، دوسروں کے فضل وکمال کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جلنے اور پھر اس کے لیے بے جا کوششیں کرنے کے بجائے اپنی خصوصیات پر توجہ دینا چاہیے، اپنے حصہ میں آئے فضل الٰہی پر شکر کرنا چاہیے اور مزید کے لیے دستِ دعا دراز کرنا چاہیے، احادیث میں خیر کے کاموں میں مسابقت کی تعلیم دی گئی ہے، ایسی تمام روایات کا تعلق خیر کے ان کاموں سے ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، چنانچہ انسان عبادات واخلاقیات، خدمتِ خلق اور دوسروں کے تعاون میں دیگر لوگوں سے آگے بڑھنے میں مسابقت کرسکتا ہے اور بلاشبہ اس کو کرنا ہی چاہیے، بلکہ صحیح معنی میں مسابقت وتنافس کا اصل میدان ہی نیکی، تقویٰ، عبادت وریاضت اور توبہ وانابت اور ایمان وعمل صالح ہے۔

چنانچہ اگر لا تتمنوا بما فضل الله به بعضكم على بعض سے نظر ہٹا کر وسئلوا الله من فضله پر عمل رہے، تو اللہ کا فضل بہت وسیع اور بے حد وحساب ہے، پھر یہ ممکن ہے کہ انسان محدود دائرے، محدود سوچ سے نکل کر سوچے اور فضل الٰہی کے حصول کی دعا کرے، اس اجتماعی بیماری کا علاج کیے بغیر معاشرے اور اجتماعی زندگی میں امن وسکون اور اطمینان کا پایا جانا ممکن نہیں ہے، آدمی کی سوچ اگر محدود ہوتی ہے تو پھر وہ یا تو گھر کے افراد سے، یا خاندان کے ارکان سے، یا شرکائے کار سے مقابلہ آرائی کرتا ہے، اس طرح اس کی زندگی پست مقاصد میں الجھ کر ایک چھت کے نیچے کی دیواروں کو اونچا کرنے کی تگ ودو میں گزر جاتی ہے، وہ ایک چہار دیواری کے اندر مناصب اور وراثتوں کے تحفظ میں اپنی صلاحیتیں کھپا دیتا ہے، افسوس کہ اس امت کی یہی کہانی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ قسمت آزمائی اور جدوجہد کے لیے ایسے میدان منتخب کرلیتا ہے جس سے وہ واقف ہی نہیں ہوتا کہ یہ میدان دراصل اس کے لیے تھا ہی نہیں، آج دنیا میں دراصل سارے فساد وانتشار اور تصادم کی یہی ایک وجہ ہے کہ لوگوں نے ترجیحات کی غلط تعیین کرلی ہے، اور کوشش ومحنت کے لیے غلط میدانوں کا انتخاب کرلیا ہے، اس کے برخلاف اگر سمت سفر درست ہو، ترجیحات کا تعین بھی درست ہو، حقیقت میں نیکی اور ثواب مطمح نظر ہو، اگر مقاصد بلند ہوں، خیالات کی پرواز اونچی ہو، بعثت محمدی کے مقاصد اور اس امت کے برپا کیے جانے کے مقاصد پر نظر ہو تو پھر سوچ میں آفاقیت ہوتی ہے، سب سے پہلے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوتی ہے، پھر معاشرے کی تعمیر کی فکر ہوتی ہے، جہاں بانی وجہاں آرائی اور تعمیر جہاں کا جذبہ انگڑائی لیتا ہے، پھر چھوٹی چھوٹی چیزیں ٹھوکروں میں ہوتی ہیں، اغماض واعراض کی عادت ہوتی ہے، گھٹیا مقاصد اور گھٹیا سیاسی چالوں سے نفرت ہوتی ہے، دل یقین کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے، تقسیم محبت کی چاہت ہوتی ہے، ہر دل عزیزی مقدر ہوتی ہے اور ایسا انسان تعمیری سوچ اور تعمیری عزم کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، یہی ہونا چاہیے، حفیظ میرٹھی مرحوم نے ہی یہ بھی کہا تھا:

ہیچ ہیں میری نظر میں آشیاں و گلستاں
آدمی ہوں، عزم تعمیر جہاں رکھتا ہوں میں

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ خاص تحریر

سید سلیمان ندوی مرحوم

(۱۳۰۲ھ-۱۳۷۳ھ)

مولانا مسعود عالم ندویؒ

حضرت سید صاحب قبلہؒ کی رحلت کو تقریباً تین مہینے ہو رہے ہیں، مگر ''چراغ راہ'' میں اب تک ان کی سیرت اور خدمات پر کچھ نہ لکھا جا سکا، اس کوتاہی کا مجرم مرحوم کا یہ حقیر خادم ہے۔ ادارہ ''چراغ راہ'' نے یہ خدمت میرے سپرد کی تھی، جسے اپنی مجبوریوں کی وجہ سے وقت پر انجام نہ دے سکا، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کی یاد سے غافل رہا۔ وفات کے فوراً ہی بعد شدید تکلیف کے عالم میں ''المسلمون'' (قاہرہ) کے لیے ایک مضمون لکھا، پھر اپنے نام کے خطوط ترتیب وتحشیہ اور ایک مناسب مقدمہ کے اضافہ کے بعد کاتب کے حوالے کئے، اور ابھی ابھی معارف کے خاص نمبر کے لئے ایک مضمون (استاد مرحوم-نقوش وتاثرات) لکھ کر فارغ ہوا ہوں۔

وطن وخاندان: سید صاحب (کہ یہ استاد مرحوم کا محبوب لقب ہے اور خاص و عام میں اسی نام سے یاد کئے جاتے تھے) کی ولادت عظیم آباد پٹنہ کے ایک مردم خیز گاؤں دیسنہ میں ہوئی۔ بہار شریف ضلع پٹنہ (بہار) میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہ علاقہ گوتم بدھ کی تپسیا کا مرکز رہا ہے، یہاں سے سات میل کے فاصلے پر نالندہ کی مشہور یونیورسٹی تھی جسے اب دوبارہ اسی نام سے زندہ کیا جا رہا ہے، اور اسی دیار میں ایک مقام پاواپوری جینیوں کے رشی مہابیر کا مدفن ہے، مسلمانوں کے دور میں بھی اس کا نام رہا ہے۔ مخدوم الملک شرف اس کے نواح میں مسلمانوں کی پرانی آبادیاں ہیں، یہاں سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر سادات کے بارہ گاؤں آباد ہیں جو عام زبان میں ''بارہ گاواں'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی بارہ گاواں کے ایک گاؤں کو سید نذیر حسین صاحب محدث (میاں صاحب) کے مرزبوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ بہار شریف ہی کے مضافات میں ملا محبّ اللہ بہاری اور غلام یحییٰ بہاری پھلے اور پھولے۔ اس دَور میں بھی یہاں بڑے بڑے نامور اہل علم پیدا ہوئے۔

سید صاحب کا وطن دیسنہ بہار شریف سے شمال مشرق آٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ گاؤں سادات بہار کی برادری میں بہت ممتاز ہے۔ سید صاحب کا خاندان بھی پشتہا پشت سے اہل علم کا خاندان تھا، آپ کے دادا، والد ماجد اور بڑے بھائی، سب کے سب عالم اور طبیب تھے، والد ماجد مولانا حکیم ابوالحسن صاحب (ف ۱۳۴۰ھ) صوفی منش اور بڑے مرتاض بزرگ تھے۔ آپ کے بڑے بھائی (جو آپ سے عمر میں بہت بڑے اور استاد بھی تھے) مولانا حکیم ابوحبیب مجددی (ف ۱۳۴۶ھ) جید عالم اور طبیب تھے، اس وقت بھی آپ کے خاندان میں متعدد اہل علم قدیم وجدید طرز تعلیم کے جامع نظر آتے ہیں۔ عظیم آباد کی ادبی تحریکوں میں بھی اس

خاندان کا خاصا دخل رہا ہے۔اب تو شاید لوگ بھول چکے ہوں، آج سے تقریباً نصف صدی پہلے پٹنہ سے شاد عظیم آبادی کی مخالفت میں مشہور اخبار الپنچ بڑی آن بان کے ساتھ جاری ہوا تھا،اس نے پورے ملک میں ایک ادبی حیثیت قائم کر لی تھی، اس کے لکھنے والوں میں سید صاحبؒ کے متعدد عزیز نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔

ابتدائی تعلیم اور ندوہ: ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے بڑے بھائی سے اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری میں پائی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی کشش انہیں لکھنؤ لے یہ عجیب حسن اتفاق کہ ندوہ کی تحریک میں شروع ہی سے اہل بہار پیش پیش تھے۔مولانا محمد علی مونگیریؒ (خلیفہ اعظم مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی) اور شاہ سلیمان صاحبؒ پھلواروی تو گویا اس کے بانیوں ہی میں تھے۔دیسنہ کے ایک بزرگ اور سید صاحبؒ کے عزیز حافظ تجمل حسین صاحب (خلیفہ مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی) بھی اس میں پیش پیش تھے اور انھیں کی ترغیب سے سید صاحبؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔

ندوہ کا یہ ابتدائی دور تھا اور موسم بہار بھی۔استاد الاستاذ مولانا شبلی نعمانیؒ حیدرآباد دکن سے مستعفی ہوکر مستقل طور پر ندوہ کی زمام تعلیم اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے، جوہر شناسی میں مولانا مرحوم کو کمال حاصل تھا۔مکاتب شبلی میں ندوہ کے جس طالب علم کا بھی کسی درجے میں ذکر خیر آیا ہے، وہ آخر دنیائے علم وادب میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔شبلیؒ کی نگاہ جوہر شناس نے سید سلیمان کی صلاحیتوں کا فوراً ہی اندازہ کرلیا اور وہ استاذؒ کے خاص مقرب طلبہ میں شمار ہونے لگے۔انھیں دنوں مولانا ابوالکلام بھی رسالہ ''الندوہ'' کے معاون کی حیثیت سے مولانا شبلی کی تربیت میں تھے،اس وقت کے ذہین طلبہ میں ضیاء الحسن علوی بھی نمایاں تھے۔عبدالسلام ندوی کا شمار تو سید صاحب کے ساتھ ساتھ ہوتا تھا، رکن الدین دانا سہسرامی اور سید ظہور احمد وحشی بھی سید صاحب کے ہم سبق یا معاصر تھے۔

فراغت اور علمی زندگی: سید صاحب ۱۹۰۶ء میں فارغ التحصیل ہوئے،اسی سال سالانہ جلسہ میں ان کے جوہر نمایاں ہوئے،خواجہ غلام الثقلین کے دئے ہوئے موضوع پر جوانہوں نے برجستہ تقریر عربی میں کی تو مجمع ششدر رہ گیا اور استاد نے فرط مسرت میں اپنا عمامہ عطا فرمایا۔اس کے بعد چند سال دارالعلوم میں تدریس کی خدمت انجام دی۔عربی ادب آپ کا خاص مضمون تھا۔اسی زمانہ میں بچوں کی تعلیم کے لئے دروس الادب نامی ریڈرس لکھیں اور آگے چل کر جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری مرتب کی اور پھر استاذ کے مکمل لٹریری اسسٹنٹ ہو گئے۔سیرت کے کاموں میں استاذ کی مدد کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تحقیق بھی جاری رکھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسالہ الندوہ (جو اس زمانہ کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ تھا) کی نائب ایڈیٹری تفویض ہوئی۔(۱۹۱۱) جسے انہوں نے پوری شان کے ساتھ نباہا اور علمی حلقوں میں اپنی ساکھ قائم کر لی۔غالباً ''حیات مالک'' بھی اسی دور میں لکھی، پھر ندوہ کی اندرونی سیاست نے پلٹا کھایا،مولانا شبلی کا اثر کم ہوتا گیا،سید صاحب بھی اخبار الہلال کے شعبہ ادارت سے منسلک ہو گئے۔مولانا ابوالکلام سے تعلقات تو تھے ہی، انہوں نے کھینچ بلایا،وہاں ان کے قلم کی گلکاریوں نے کچھ اور رنگ دکھایا۔ کہاں شبلی کا عالمانہ،سنجیدہ اور دلنشین (اور سید صاحب کی زبان میں ماقل و دل) اسلوب تحریر اور کہاں ابوالکلام کا تحدیانہ (Challenging) زور بیان،اور وہ سیل رواں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا،مگر سید صاحب نے دکھا دیا کہ ان کا اشہب قلم

ہر میدان میں جولانیاں دکھا سکتا ہے، مدیر الہلال کے رنگ میں وہ لکھنے گئے، تو اس طرح کہ دونوں کی تحریروں میں فرق کرنا مشکل ہوگیا، یقین نہ آئے تو الہلال کا مقالہ ''مشہد اکبر'' پڑھ کر دیکھ لیجیے، وہ مشہور مقالہ جو مسجد کانپور کی شہادت پر لکھا گیا ہے، اور جس کا آغاز خاص ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے:

''زمین پیاسی ہے، کس کی؟ مسلمانوں کے خون کی؟ الخ''

ہاں! وہ مشہور مقالہ، جس نے سینکڑوں دلوں کو گرما دیا اور ہزاروں آنکھوں کو اشک بار کیا، اور جس سے ایوان حکومت میں تہلکہ مچ گیا تھا، وہ تاریخی مقالہ سید سلیمان ہی کے قلم کا مرہون منت تھا۔

الہلال میں بہت زیادہ عرصہ نہ رہے، پونہ میں شیخ عبدالقادر صاحب (پروفیسر دکن کالج) کی لکچراری قبول کرلی، پر وہاں بھی کچھ زیادہ دنوں رہنا مقدر نہیں تھا۔ مولانا شبلی کے دماغ میں ایک اکاڈمی کا خاکہ تو عرصے سے تھا، مگر ندوہ سے قطع تعلق کے بعد یہ خیال پختہ ہوگیا۔ اعظم گڑھ ہی کو مرکز بنانے کی اسکیم تھی، مولوی مسعود علی (جن کی انتظامی صلاحتیں اسی زمانہ میں نمایاں ہونی شروع ہوگئی تھیں) ابتدائی انتظامات کے لئے بلائے جا چکے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں استادؒ کا وقت آ گیا، بستر مرگ سے مولانا حمید الدین فراہی کو حیدرآباد دکن، مولانا ابوالکلام کو کلکتہ اور سید صاحب کو پونہ تار دئے گئے، سید صاحب فوراً استاد کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور استادؒ نے آخری وقت نہایت شفقت ومحبت سے اپنے چھوڑے ہوئے کاموں، خاص کر سیرت کی تکمیل کی وصیت کی۔

مولانا حمید الدین حیدرآباد میں قیام رکھتے تھے، مولانا ابوالکلام کلکتہ میں اور دونوں کا اپنے مستقر کو چھوڑ کر آنا مشکل بھی تھا۔ وابستگان شبلی نے سید سلیمان کے سر پر جانشینی کا تاج رکھا، اور وہ ملازمت چھوڑ اعظم گڑھ کے جھونپڑے (جو اس وقت جھونپڑا ہی تھا) میں آ کر مقیم ہو گئے، دارالمصنّفین کی تشکیل ہوئی، (۱۹۱۴ء)۔ استاذ صرف خاکہ ہی تیار کر پائے تھے، شاگرد نے اس میں رنگ بھر کر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ سید صاحب ناظم اور مولانا فراہی صدر نشین قرار پائے، اور پھر تو سید صاحب نے وہ کچھ کیا، جو اسلامی ہند کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستان تو ہندوستان، پورے اسلامی ممالک میں ایسی اکاڈمی نظر نہیں آتی، مصر کی ''لغوی اکادمی'' (المجمع اللغوی) خالص سرکاری ادارہ ہے، اور مصارف کے مقابلے میں کام کچھ بھی نہیں، پھر اس کا دائرہ عمل زبان تک محدود ہے۔ دمشق کی اکاڈمی ''المجمع العلمی العربی'' البتہ تیس سال سے قائم ہے، اور اس نے گراں قدر علمی وادبی خدمات بھی انجام دی ہیں، مگر وہ بھی اکثر حکومت کے خرچ پر چلتی ہے، اسی طرح ''تطوان'' (اسپینی مراکش) کا علمی ادارہ معہد مولای الحسن للنشر والتالیف بھی حکومت کے مصارف سے اور اس کی نگرانی میں جاری ہے۔ دارالمصنّفین اس باب میں خاص امتیازی شان رکھتا ہے، یہ اپنی تشکیل ونظم میں بالکل آزاد تھا اور ہے، ادارہ کے تشکیل پاتے ہی معارف کا اجرا عمل میں آیا، (۱۹۱۶ء) اور آج تک اسی آن بان سے جاری ہے، شروع شروع میں اکثر مقالات سید صاحب خود لکھتے، پھر آہستہ آہستہ ان کے شاگردوں اور رفیقوں نے رسالہ کا بار اپنے کاندھوں پر لے لیا، سید نجیب اشرف ندی (پروفیسر اسمٰعیل کالج بمبئی)، سید ریاست علی ندوی (پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ) اور شاہ معین الدین احمد ندوی مختلف ادوار میں استاد کا ہاتھ بٹاتے رہے اور اب تو ایک عرصہ سے شاہ صاحب ہی اس کے کرتا دھرتا ہیں، اللہ تعالی انہیں زیادہ سے زیادہ علم وعمل کی دولت سے نوازے کہ استادؒ کی مسند کا وقار قائم رہے۔

معارف کے ذکر میں ایک اہم بات اور قابل لحاظ ہے۔ اصل میں یہی وہ میدان تھا جہاں سید صاحبؒ کے حقیقی جوہر کھلے، اور اسی کے شذرات میں وہ اسلوب تحریر پروان چڑھا، جسے شبلیؒ اور ابوالکلام کے اسالیب بیان کے درمیان مناسب ''امتزاج'' کی حیثیت دی جاسکتی ہے، گواس کا رجحان شبلی کے ماقل ودل طرز انشاء کی طرف زیادہ ہے۔ خطبات مدراس میں کہیں کہیں ابوالکلامیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ معارف کے کس کس حسن کو بتایا جائے؟ پچھلے تیس سال میں جو فتنہ بھی اٹھا، معارف اس کے مقابلہ میں پیش پیش رہا، ''نگار'' کے ہفوات ہوں یا اسلم جیراج کی ابلہ فریبیاں، سید سلیمان اور ان کے رفیقوں کا لشکر معارف کے محاذ پر سرکوبی کے لیے تیار۔

سید صاحب ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۰ء تک معارف کے مدیر اور نگراں رہے، اس مدت میں ان کے قلم سے سینکڑوں مقالات نکلے اور بیسیوں اہل علم و اہل قلم ان کی آغوش میں تربیت پا کر علم وفن کے علم بردار بنے، ندویوں ہی پر موقوف نہیں، دوسرے حلقوں اور درس گاہوں کے تعلیم یافتہ بھی ان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی سے لکھنے پڑھنے کے آداب سے آشنا اور علمی دنیا میں روشناس ہوئے۔

تصنیفات: ان سب مشاغل کے باجود وہ اپنے اصلی کام میں منہمک رہے، ''سیرۃ النبی'' کی چھ ضخیم جلدیں اس شان سے لکھیں اور شائع کیں کہ پورے اسلامی لٹریچر میں اس کی مثال نہیں۔ مولانا شبلیؒ نے صرف پہلی دو جلدیں لکھی تھیں اور وہ بھی نامکمل، شاگرد نے پہلے انہیں مکمل کیا اور اپنے اضافے قوسین کے درمیان درج کئے، تاکہ استادؒ کے ساتھ سوء ادب اور ان کی پاکیزہ تحریر کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائے، باقی چار معرکۃ الآرا جلدیں خود ان کی محنت اور سالہا سال کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ جن اہل علم نے جلد چہارم کا مقدمہ منصب نبوت پڑھا ہے وہ اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اس پایہ کی چیز عربی زبان میں نظر نہیں آتی، ساتویں جلد سیاسیات پر زیر ترتیب تھی کہ فرشتہ اجل نے مہلت نہ دی، اللہ کرے وہ ان کے کسی رفیق یا شاگرد کے قلم سے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ مولانا عبدالباری ندوی اپنے خانقاہی ذوق سے کچھ دیر کے لئے الگ ہوسکیں تو وہ اس کے سب سے زیادہ اہل ہیں ورنہ شاہ معین الدین ندوی صاحب ہی کو یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔

سیرۃ النبی کے علاوہ سید صاحب کی دوسری تصنیفات اپنی خاص حیثیت رکھتی ہیں، تحقیق اور ریسرچ کا خاص سلیقہ تھا، جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک ایک موضوع پر بیس بیس برس تلاش جاری رکھتے تھے۔ ایک وقت میں متعدد موضوع ان کے زیر نظر ہوتے، اور اس سے متعلق جہاں کوئی بات نظر آتی، اسے خاص نوٹ بک میں ٹانک لیتے، یہ سلسلہ برسوں جاری رہتا، یہاں تک کہ جب کافی مواد جمع ہو جاتا تو قلم اٹھاتے اور اس شان کے ساتھ کہ گویا اس موضوع پر لکھنا ان کے لئے مخصوص تھا۔ تحقیق اور چھان بین کا یہ اہتمام دور حاضر کی اسلامی دنیا میں سید صاحبؒ کے علاوہ صرف احمد تیمور پاشا مصری (ف ۱۹۳۰ء) ہی کے یہاں ملتا ہے، سید صاحب قبلہؒ کے اس ذوق اور طرز تحقیق کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، مگر اس مختصر صحبت میں ان تفصیلات کا موقع نہیں۔

سیرت کے علاوہ ان کی تصنیفات میں ارض القران، خیام، سیرت عائشہ، حیات مالک، عرب وہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، حیات شبلی زیادہ مشہور ہیں، سیرت پر ان کی دو چھوٹی کتابیں بھی ہیں اور دونوں اپنی جگہ پر تنقید وتعریف سے بالاتر۔

خطبات مدراس متوسط درجہ کی استعداد والوں کے

لئے ''رحمت عالم'' بچوں اور کم لکھے پڑھے بالغوں کے لئے۔ خطبات مدراس تو مشہور ہے، ''رحمت عالم'' کے متعلق اپنا تاثر یہ ہے کہ یہ سید صاحب قبلہؒ کی تحریروں میں خاصہ کی چیز ہے۔ راقم نے اسے جب بھی پڑھا، از حد متاثر ہوا، اور آنسوؤں کی خاصی مقدار اس کی نذر کرنی پڑی۔ ان تصنیفات کے ساتھ اگر ان کے بے شمار مقالات کو ملا لیا جائے تو حضرت الاستاذؒ کی تالیفات سو سے اوپر ہو جائیں گی، مگر ابھی صرف ایک مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے چھپا ہے، دوسرا مجموعہ ''یادرفتگان'' کے نام سے شائع ہو رہا تھا کہ مصنف انہیں کی صف میں شامل ہو گئے، جن کی یاد میں یہ مقالات لکھے گئے تھے۔ مکاتب میں بھی ان کے طرز انشا کی ایک خاص صنف ہے، ابھی صرف ایک مجموعہ ''بریدفرنگ'' کے نام سے چھپ سکا ہے، اس میں وہ خطوط ہیں جو انہوں نے وفد خلافت کے موقع پر یورپ سے اپنے دوستوں کو لکھے تھے۔ اب تو یہ ایک تاریخی چیز بھی ہوگئی ہے، اس سے سید صاحب کی فراست اور سیاسی بصیرت کا بھی پورا اندازہ ہوتا ہے، ان کی پیش گوئیاں اور پیش بینیاں تو حد درجہ حیرت انگیز ہیں، اب ان شاءاللہ ان کے مکاتب کے متعدد مجموعے شائع ہوں گے (ایک مجموعہ راقم بھی جلدی ہی شائع کر رہا ہے)۔ اسی طرح سفرنامہ بھی استاد مرحوم کی تصنیفات میں شامل ہے۔ سیاحت افغانستان کی روداد مفصل معارف میں لکھی تھی، غالباً وہ کتابی صورت میں شائع ہو چکی تھی، عرب ملکوں کا سفرنامہ بھی (میرے عرب کے تین سفر) کے نام سے مرتب کر رہے تھے، مگر شاید پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ان کی عربی تصانیف اور عربی انشاء پردازی اس سے الگ ہے، سید صاحبؒ عربی بہت سادہ، سلیس لکھتے تھے وہ ان کا ایک خاص طرز تھا، مگر یہ مشغلہ ۱۹۱۲ء کے بعد باقی نہ رہا۔ اسی لئے عربی میں جو کچھ اس دور میں لکھا یا لکھ رہے تھے وہ مکمل نہ ہو سکا۔

سیاسی زندگی: سید صاحب طبعی طور پر ہنگامہ آرائیوں کے آدمی نہیں تھے اور اسی لئے جب انہیں زندگی میں ایسے مواقع آئے، ان کا ساتھ نہ دے سکے یا مقابلہ نہ کر سکے، پھر بھی ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں سیاسیات کی خارزار وادی سے دامن بچا کر نکلنا ممکن نہ تھا، تحریک خلافت میں علمی و عملی شرکت کی، متعدد کانفرنسوں کی صدارت کی، دو رسالے ''دنیائے اسلام اور خلافت'' اور ''خلافت اور ہندوستان'' تحریر فرمائے، اور پھر وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے یورپ کا سفر کیا۔ (۱۹۲۰) وہاں ان کی عربی دانی بہت کام آئی، پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر، دنیائے اسلام کے وفود یورپ کے بڑے شہروں کا طواف کر رہے تھے، ان کی زبان عربی تھی یا فرنچ جانتے تھے، ہمارے وفد کا سالار اور اسلامی ہند کی آنکھوں کا تارا (محمد علی رحمۃ اللہ علیہ) نہ عربی بول سکتا تھا نہ فرنچ، ایسے موقعوں پر سید صاحب کام آتے تھے۔ بریدفرنگ میں اس کی جھلکیاں ملیں گی۔

اسی طرح دو مرتبہ حجاز وفد لے کر گئے۔ آخری مرتبہ ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی کے موقع پر جب کہ پوری دنیائے اسلام کا عطر مکہ مکرمہ کھنچ آیا تھا، سید صاحب وفد خلافت کے رئیس تھے، دوسرے ارکان محمد علی، شوکت علی اور شعیب قریشی (موجودہ وزیر پاکستان) تھے۔

وہاں سید صاحب کا یہ خاص اعزاز ہوا کہ پوری موتمر کے نائب صدر منتخب ہوئے، جس پر تمام ممبروں نے اسلامی ہند کو مبارکبادیاں دیں، صدر موتمر شریف شرف عدنان تو اپنی خاندانی سیادت و وجاہت کی بنا پر منتخب ہوئے تھے، لیکن نائبین صدر کا انتخاب صلاحیت و ہر دلعزیزی کی بنا پر ہوا۔

دنیائے اسلام کے ان دو نامور فرزندوں میں ایک وفد خلافت ہند کے رئیس سید سلیمان ندوی تھے اور دوسرے فلسطین کی مجلس اسلامی اعلی (مسلم سپریم کونسل) کے صدر سید امین الحسینی، دونوں اپنی اپنی جگہ شرافت و مروت کا مجسمہ اور صداقت و اخلاص کا پیکر۔

اس کے علاوہ سید صاحب نے ۱۹۱۷ء میں جمعیت علمائے اسلام بنگالہ اور ۱۹۲۵ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس کلکتہ کی صدارت کی، معارف پریس کا چھپا ہوا ان کا دیدہ زیب خطبۂ صدارت اب بھی راقم کی نگاہوں کے سامنے پھر رہا ہے، والد ماجد صاحب قبلہ مدظلہ اجلاس سے واپسی پر لائے تھے اور راقم نے اپنی نوعمری کے باجود بڑے ذوق وشوق سے پڑھا تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۶ء کی بھی صدارت کی۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کا خطبۂ صدارت بھی علمی اعتبار سے پڑھنے کی چیز ہے۔ راقم نے اس کا عربی ترجمہ اس وقت عربی اخبارات میں شائع کرایا تھا۔

سید صاحبؒ تحریک آزادی ہند کے سرگرم حامی اور کانگریس کی شرکت کے پُر جوش قائل تھے۔ نہرو رپورٹ کے اختلافی دور میں بھی (۲۹- ۱۹۲۸ء) ان کا رجحان کانگریس ہی کی طرف تھا، گو وہ اس وقت عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہو چکے تھے، زندگی کے آخری دور میں جہاں ان کے مسلک ورجحان فکر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں، وہاں وہ مسلم لیگ کی طرف بھی مائل ہو گئے تھے، یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات عرض کر رہا ہوں، جب لیگ اور کانگریس کے تصادم نے ایک فکری کشمکش کی شکل اختیار کر لی تھی، مگر یہ میلان فکر ونظر کی حد تک تھا۔ عملاً وہ سیاسی حیثیت سے عزلت پسند اور گوشہ نشیں ہی رہے۔

علمی مقام: سید صاحبؒ کا علمی مقام بلند تھا، اتنا بلند کہ وہاں تک شاید بہتوں کا طائر خیال بھی پرواز نہ کر سکے۔ ان کی جامعیت تو اس دور میں اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہل علم واہل نظر ہیں، صرف ہندوستان کے نہیں بلکہ دوسرے مسلمان ملکوں کے بھی، مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم وفن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی۔ علامہ سید رشید رضا (ف ۱۹۳۳ء) قرآن وحدیث وفقہ اور عربی زبان وادب اور ان کے متعلقات کے امام تھے، عربی سیاسیات میں بھی انہیں درخور تھا، لیکن وہ کوئی مغربی زبان نہیں جانتے تھے اور نہ کوئی دوسری مشرقی زبان، ممکن ہوتر کی سے آشنا رہے ہوں۔ تاریخ، جغرافیہ اور معقولات وغیرہ میں خاص درک نہیں تھا۔ امیر شکیب ارسلان (ف ۱۹۴۶ء) ہر لحاظ سے جامع کمالات تھے، لیکن دینی علوم میں ان کی حیثیت ایک مبتدی کی تھی۔ مولانا ابوالکلام زبان وقلم کے بادشاہ ہیں، مگر ان کا علم ٹھوس نہیں، یہ صاف بیانی شاید بعض لوگوں کو شاق گزرے، لیکن یہ رائے پوری طرح سوچ سمجھ کر اور مولانا کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد عرض کی جارہی ہے۔ مولانا ابوالکلام سے عاجز کو بڑی عقیدت ومحبت رہی ہے، محبت تو اب بھی ہے، گو اختلاف فکر ومسلک کے باعث پہلی عقیدت نہیں رہی، لیکن نقد کے مقام میں محبت وعقیدت کا کوئی سوال نہیں، یہاں تو وہی بات کہی جائے گی جو حقیقت سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کے برخلاف سید صاحبؒ ایک طرف قرآن وحدیث وفقہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں تو دوسری طرف تاریخ وادب کے میدان میں بھی بڑے بڑے شہسواروں سے آگے ہیں۔ مولانا ابوالکلام اور ہندوستان کے دوسرے اہل علم کی طرح صرف اردو ہی میں لکھنے پر قادر نہیں تھے، عربی انشا پردازی میں بھی ان کے جوہر خوب کھلتے تھے، علامہ سید رشید رضاؒ کی طرح جدید علوم

اور مغربی زبانوں سے نا آشنا نہیں تھے، انگریزی اچھی جانتے تھے اور فرنچ سے آشنا تھے، فارسی ادب کا بھی ستھرا ذوق تھا۔ جغرافیہ اور خاص کر عربوں کے علم جغرافیہ پر وہ حجت (اتھارٹی) تھے، ممکن ہے عرب ملکوں میں ان کا لیول مل جائے یا ان پر فوقیت لے جائے، لیکن اسلامی ہند میں عربوں کے جغرافیہ کی گہرائیوں سے واقف ان سے بڑھ کر کوئی نہیں تھا۔ یہ میں پوری قطعیت کے ساتھ کہہ رہا ہوں، ان کی تصنیفات (عربوں کی جہاز رانی اور علم الجغرافیہ عندالعرب) سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہرفن مولا تھے، علم کے ہر شعبے میں انہیں درک تھا، اور معقولات یونانی میں بھی انہیں اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی، قدیم ہیئت سے بھی پوری واقفیت تھی۔ میں نے اس تقابل وموازنہ میں مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نام قصداً نہیں لیا ہے، مولانا فراہی، استاد الاستاذ مولانا شبلی کے عزیز خاص اور سید صاحبؒ کے مخدوم تھے، اپنے دائرہ علم میں ان کی امامت مسلم ہے، سید صاحبؒ ان سے برابر مستفید ہوتے رہے، سیرۃ النبی جلد سوم میں خود اس استفادہ کا اعتراف کیا، غالباً الفاظ اس طرح ہیں (پر ٹھیک ٹھیک یاد نہیں، معنی یہی ہیں اس بات کا اطمینان ہے):

''مخدومی مولانا حمید الدین سے مشکلات وغوامض کی عقدہ کشائی میں بہت مدد ملی'' اور کما کتب اس لئے مولانا فراہیؒ ان کے معاصرین کی فہرست میں نہیں آتے، بلکہ ان کے مخدومین مولانا فاروق چریا کوٹی (سید صاحبؒ اور مولانا شبلیؒ دونوں کے استاذ) اور مولانا شبلیؒ کی صف میں ان کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

شاعری: سید صاحبؒ نوعمری سے شعر کہتے تھے، پھر عربی ادب کے ذوق کے بعد عربی میں کہنے لگے، معارف کے ابتدائی دور میں رمزیؔ کے نام سے ان کی متعدد نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ حیات مالک کے آخر میں بھی ایک نظم ہے، عربی نظمیں رسالہ ''الضیا'' میں شائع ہوتی رہیں، یہ سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا، لیکن چونکہ ان کی دوسری حیثیتیں بہت بلند ہوگئی تھیں، اس لئے ان کی شاعری مدھم پڑ گئی اور زیادہ مشہور نہ ہوسکی۔

مسلک اور طریق فکر ونظر: سید صاحبؒ طالب علمی کے زمانہ ہی سے تحقیق اور آزادنہ رائے قائم کرنے کے عادی تھے، پختگی کے ساتھ ساتھ اس شوق تحقیق نے ایک طرز فکر کی شکل اختیار کر لی، یعنی تقلید کا قلادہ انہوں نے گردن سے اتار پھینکا، ہر مسئلے کو چھان پھٹک کر اپناتے، ان کی تمام تصنیفات اس بات کی شاہد ہیں، یہ طرز فکر طبعاً انہیں شیخین (ابن تیمیہؒ وابن قیمؒ) کی تصنیفات کی طرف لے گیا، جس سے وہ عقائد میں سلفی المشرب بن گئے۔ سیرۃ النبی جلد سوم اسراء کا باب پڑھیے، بحث کے خاتمہ پر انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ ابن ہشام کے الفاظ میں سلف کے عقیدہ (اسری بہ) پر ہمارا ایمان ہے۔ تراجم علمائے حدیث (مولفہ ابو یحیٰ محمد امام خان نوشہروی) کے مقدمہ میں بھی اپنے مسلک اتباع حدیث کا ذکر انہوں نے بڑے البیلے انداز میں کیا ہے۔ عبارت کے نقل میں اب حافظہ بھی ساتھ نہیں دیتا، پر اتنا یاد ہے کہ اس ٹکڑے کا اختتام اس معنی خیز مصرعہ پر ہوا ہے:

''دوستاں تہمت این شیوہ بہ ما نیز کنند''

نظر وفکر کا یہ انداز ۱۹۴۰ء تک قائم رہا، اس کے بعد آہستہ آہستہ تبدیلی ہونے لگی، تا آنکہ آخری دنوں میں وہ اس طریق نظر وفکر سے تقریباً الگ ہو چکے تھے۔ راقم نے جیل سے بہ سبیل تذکرہ خدمت عالی میں عرض کیا تھا (جولائی ۳۵ء) ''نیل الاوطار'' (شوکانی) تہذیب السنن منذری (مع شرح

خطابی وتعلیقات ابن قیم) شروع کی ہے'' جواب ملا:

''دوسرا رخ بھی دیکھو، میں بھی اس منزل سے گذر چکا ہوں''۔الخ۔(اسی سے ملتے جلتے الفاظ تھے)۔گفتگو میں بھی یہ رجحان نمایاں تھا، فقہی مسلک میں تبدیلی کے علاوہ تصوف سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا، اور اصل میں تصوف کا تعلق ہی فقہی مسلک میں تبدیلی کا باعث ہوا، گو وہ فرماتے تھے کہ میں نے بیعت میں فقہی مسلک کو پابند نہیں کیا ہے، نیز زندگی کے دوسرے مسائل میں بھی متصوفانہ نقطۂ نظر غالب نظر آرہا تھا، یوں کبھی کبھی ان کا اپنا اصلی رنگ دکھ جاتا تھا، ہمارے سامنے ''فکر سلیمانی'' کے ان دونوں رخوں کی متعدد مثالیں ہیں، پر یہاں شرح وتفصیل میں پڑنا ممکن نہیں۔

ان کے مسلک تصوف وسلوک کے معتقد برا نہ مانیں، ہم سید صاحبؒ کو مفسر ومحدث وفقیہ ومورخ وادیب پہلے مانتے ہیں اور صوفی بعد میں۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انتہائی محبت وعقیدت کے باوجود ہمیں ان کے مسلک تصوف سے دلچسپی نہیں، اور یہ کچھ سید صاحب قبلہؒ کے ساتھ مخصوص نہیں، اسلامی ہند کے مفکر اول اور سرتاج مصلحین شاہ ولی اللہ دہلوی کے ساتھ بھی ہمارا یہی معاملہ ہے، ہم فقیہ ومحدث ولی اللہ کو مانتے ہیں، حجۃ اللہ البالغہ اور ازالۃ الخفا کے مصنف کے طرز بحث ونظر کے ہم دلدادہ ہیں، صوفی ولی اللہ اور وحدت الوجود کے قائل شاہ صاحب سے ہمیں دلچسپی نہیں۔ اور جب موقع آ گیا ہے تو بات صاف صاف کیوں نہ کہہ دی جائے، ہمیں صرف کتاب وسنت سے دلچسپی ہے، ہم حق کو اشخاص سے نہیں پہچانتے، بلکہ اشخاص کو حق کی کسوٹی پر رکھ کر جانچتے ہیں۔ان سخن گسترانہ کلمات کے بعد سید صاحب مرحوم کے معتقدوں سے ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں، کوئی غلط فہمی نہ ہو۔سید صاحبؒ آپ کے کم ہمارے زیادہ ہیں، آپ تو صرف ان کی آخری دہ سالہ زندگی کے ثنا خواں ہیں اور ہم ان کی پوری زندگی کے کارنامے کو ان کے لئے توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔آپ تو اس لئے ان کے مداح ہیں کہ انہوں نے آپ کے خانوادوں میں سے ایک خانوادہ کے ساتھ اپنا سلسلہ جوڑ لیا اور ہم تو جز ووکل ان کا اپنا سمجھتے ہیں۔آپ نے دعائے مغفرت پڑھ کر بس کر لی، ہمارا تو رونا ندگی بھر کا ہے اور مرتے دم تک عہد وفا پر قائم رہتے ہوئے ان کے کارناموں کو اجاگر کرتے رہنے کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے۔

اخلاق وعادات: سچ کہا ایک دوست نے، سید صاحبؒ میں ان کی انسانیت کے سوا اور کوئی خوبی نہ ہوتی تو بھی وہ دنیا کے بڑے آدمی ہوتے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی شرافت ومروت کم دیکھنے میں آئے گی۔سید صاحبؒ کسی کو رنج کرنا جانتے ہی نہیں تھے، ان کا غصہ بھی اپنی ایک ادا رکھتا تھا، ۵۲ برس مسلسل راقم کا ان سے گہرا تعلق رہا، سخت ناگوار سے ناگوار عالم میں بھی جھڑکی نہیں سنی۔دو موقع ایسے آئے کہ میں سخت ڈانٹ کا مستحق تھا، مگر واہ رے شرافت ونیکیِ طبع! کہ صرف معمولی تنبیہ پر قناعت کی۔دارالعلوم ندوہ اور دارالمصنّفین کے انتظام واہتمام میں اختلاف کے بے شمار موقعے آئے، ان کے رفیقوں اور چھوٹوں نے بسا اوقات انہیں تکلیف بھی پہنچائی اور وہ مکمل با اختیار ہونے کے باوجود معاف کرتے رہے۔آخر ایک دن ایسا آیا کہ تنگ آ کر خود خاموشی کے ساتھ الگ ہو گئے۔یہ موقع نہیں کہ ندوہ اور دارالمصنّفین کی سیاسیات کو چھیڑوں، اس کے لئے اہل ندوہ ہی کے رسالے اور اخبار مناسب ہوں گے۔بہر حال آج نہ کل ''سید مظلوم'' کی مظلومیت تو بیان کرنا ہی ہے، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مرحوم شرافت وحسن اخلاق کا مجسمہ تھے، وہ اپنے عزیزوں تک کو

رنج کرنا نہیں جانتے تھے اور کہیں انہیں خیال ہو جائے کہ ان کے کسی جملے سے کسی عزیز کو رنج پہنچی ہے تو فوراً اس کی تلافی کرتے، راقم کو خود ایسے مواقع پیش آئے ہیں، ایک واقعہ ایام قیام کراچی کا بیان کردوں تو شاید استاذ مرحوم کی طبیعت اور مروت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ فروری ۵۱ء میں کراچی جانا ہوا، اکثر حضرت الاستاذؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا، ایک دن راقم کی ''دیار عرب میں'' کی داد دیتے ہوئے فرمایا ''یہ تمہارا دوسرا سفرنامہ ہے۔ پہلا سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کا تھا جو باطنی مذہب کی تبلیغ کے لئے عالم اسلام کا جائزہ لینے نکلا تھا''، راقم کو اس تشبیہ سے سخت تکلیف پہنچی، مگر استاذؒ کے ادب سے خاموش رہ گیا، دوسرے دن اپنے دوست محمد ناظم صاحب سے اس کا ذکر کیا، یہ تذکرہ جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ جانتا تھا کہ محمد ناظم صاحب از خود اس خادم کے تاثرات بارگاہ سید تک پہنچا دیں گے، اور وہی ہوا دوسرے دن محمد ناظم صاحب آئے اور کہنے لگے، میں نے اصلاح ذات البین کے لئے سید صاحب سے ذکر کر دیا تھا، انہیں بہت افسوس ہوا، انہوں نے محض تفریحاً یہ بات کہی تھی، اسی روز شام کو چھوٹے صاحبزادے (سلمان میاں سلمہ اللہ) حضرۃ الاستاذ کے دست خاص کا ایک رقعہ لے کر تشریف لائے، جس کی نقل ہو بہو درج ذیل ہے:

" وانہ من سیلمان و انہ بسم اللہ الرحمن الرحیم" مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء اعزعزیزان مولوی مسعود عالم صاحب ندوی حفظکم اللہ تعالیٰ وسلم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ، اب آپ اپنے ضروری مشاغل سے فرصت پا چکے ہیں، اس لیے جی چاہتا ہے کہ آپ کو اپنے دارالغربہ میں کل رات کو بعد مغرب اپنے ساتھ کھانے کی زحمت دوں۔ آپ اور آپ کے میزبان سلطان صاحب اور آپ کے رفیق تشریف لا کر مسرور فرمائیں، برادرم مولوی ناظم صاحب اور حکیم نصیر الدین صاحب کو بھی بلا رہا ہوں۔ والسلام..... سید سلیمان''۔

یہ بالکل نئی چیز تھی، سید صاحب قبلہ کے یہاں بارہا ٹھہرا ہوں اور بیسیوں مرتبہ کھانے پینے میں بے تکلفی کے ساتھ شرکت کی ہے۔ صرف سلمان میاں کا آجانا کافی تھا، دعوت رقعہ کا اعزاز صرف اس اثر کے دور کرنے کے لئے تھا، مجھ پر طبعاً اس کا بہت اثر ہوا۔ سلمان میاں سے صرف اتنا کہا، مجھ نیاز مند کے لئے رقعہ کی کیا ضرورت تھی؟ آپ کا تکلیف کرنا کافی سے زیادہ تھا۔

یہ واقعہ نمونہ کے طور پر ذکر کیا گیا، معارف کے خاص نمبر کے لئے جو مقالہ راقم نے لکھنے کی کوشش کی ہے اس میں اس قسم کے متعدد واقعے آگئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سید صاحبؒ کا حسن اخلاق ضرب المثل تھا، مہمان نوازی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس کا لطف کچھ دیسنہ میں ان کے نوتعمیر بنگلہ پر آتا تھا، کراچی کے غربت کدہ میں وہ انشراح صدر اور فراغ خاطر کہاں نصیب؟۔

اس کے علاوہ سید صاحبؒ کے دوسرے عادات بھی بڑے پاکیزہ تھے۔ قہقہہ تو شاید کبھی آپ سے ظہور میں آیا ہی نہیں، زیر لب مسکراتے، کبھی کبھی دانت کھل جاتے، لباس سادہ مگر صاف اور ستھرا، غذا بہت کم، حیرت ہوتی تھی کہ ان کی زندگی کس طرح قائم ہے؟ طبیعت میں سخاوت اور فیاضی تھی، اسراف بھی نہیں، بڑی معتدل اور ستھری زندگی تھی۔

اس مختصر سی صحبت میں کیا کیا بیان کیا جائے۔

(ماہنامہ چراغ راہ کراچی مارچ ۱۹۵۴ء)

☆☆☆

❑ تاریخ کے جھروکوں سے

قسط-۱

''اسلام میں مذہبی رواداری''

(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ)

ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

مذہبی رواداری کے موضوع پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی یہ کتاب منفرد نوعیت کی ہے، اردو میں اس کو اولیت کا درجہ بھی حاصل ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب کو یا کم از کم اس کی تلخیص کو ہندوستان کی ہر زبان میں شائع ہونا چاہیے، مصنف نے اس کتاب میں موضوع کو معروضی انداز میں پیش کرنے کی کامیاب ترین کوشش کی ہے، مذہبی رواداری سے متعلق اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، قرآن اور نبوی ارشادات کا جائزہ لیا گیا ہے، مسلم حکومتوں کے مختلف ادوار سے مذہبی رواداری کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، خود حضور پاک علیہ السلام اور خلفائے اربعہ کا تعامل پیش کیا گیا ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر مستقل اور مدلل تصنیف ہے، لیکن مسلمانوں کی مذہبی رواداری کے ابتدائی نقوش اور ان کی طرف اشارے درحقیقت سیرۃ النبی اور دیگر تصنیفات شبلی وسلیمان میں موجود ہیں، مصنف گرامی نے جگہ جگہ مولانا شبلی ومولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیفات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ مصنف کا احساس ہے کہ ''اسلام میں مذہبی رواداری کا موضوع اتنا وسیع ہے کہ بہت سے واقعات سمیٹنے کے باوجود پھر بھی بہت کچھ صرف نظر ہو گئے ہیں'' (ص ۸)۔

ابتدا میں تو وہ قرآن مجید اور احادیث نبوی میں وارد مذہبی رواداری کی تعلیمات اور ان پر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین نے جس طرح عمل کیا اس کو پیش کر کے کتاب کو ختم کر دینا چاہتے تھے، لیکن پھر انہوں نے مسلم حکمرانوں کی مختلف حکومتوں کے دوران مذہبی رواداری کی مثالیں جمع کرنے کی بھی سعی مشکور کی، ساتھ ہی اپنے اس خیال کو بھی عملی جامہ پہنایا کہ:

''عیسائی مؤرخین مسلمانوں کی عدمِ رواداری کا ذکر بہت بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں، اگر عیسائیوں کی مذہبی چیرہ دستی اور سیاسی سفاکی کی عبرت ناک کہانی عیسائی مورخین ہی کی زبانی قلم بند کی جائے تو مسلمان اور عیسائیوں کی رواداری اور عدم رواداری کا موازنہ کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔'' (ص ۸)

یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے عیسائیوں کی عدمِ رواداری کی مثالیں واقعی بس جھلکیاں دکھانے کو ہی نقل کی ہیں ورنہ کتاب کی ضخامت بہت زیادہ ہو جاتی، لیکن پھر بھی وہ یک گونہ موازنہ پیش کرنے میں پوری طرح سے کامیاب ہوئے، اس سلسلہ میں انھوں نے عیسائی مصنفین کے بیانات پر ہی تکیہ کرتے ہوئے ان کے اقتباسات نقل کر کے اپنے دعوے کو مدلل کیا ہے، اس طرح کتاب کی افادیت دو چند ہو گئی ہے اور پوری تاریخ کا ایک جامع جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

کتاب کا موضوع تاریخ ہے، اس لیے اس کا اسلوب بہرحال علمی ہے یہ الگ بات ہے کہ دبستان شبلی کی خوشہ چینی کے اثر سے خالص تاریخی موضوع پر لکھتے ہوئے بھی اسلوب یکسر خشک نہیں ہوتا بلکہ ادبی رعنائی اسلوب کو پرکشش بناتی ہے اور اس طرح قاری کو کسی طرح کی اکتاہٹ نہیں ہوتی، اسی کے ساتھ یہ کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ کہیں کہیں مصنف کی رگِ غیرت پھڑک ہی گئی ہے، راقم کے نزدیک یہ قطعی معیوب نہیں کیوں کہ تاریخ نگاری کو جس طرح تعصب ونفرت کی بنیاد پر تاریخ سازی کے عمل سے گزارا گیا اور مذہب کو بدنام کرنے کے لئے جس طرح اس فن کا استعمال کیا گیا اس پر رگِ غیرت کا پھڑک جانا فطری عمل ہے، مصنف نے پوری کتاب میں بھرپور شائستگی اور غیر جانبداری کے ساتھ بالخصوص عیسائی مصنفین کی تصنیفات کو بنیاد بنا کر اسلام کی مذہبی رواداری اور اس کے بالمقابل عیسائیوں کی عدم رواداری کو پیش کیا ہے، کتاب کے بعض مباحث کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوسکتا ہے کہ ان کا موضوع سے تعلق نہیں ہے پھر بھی ان کو طول دیا گیا، مگر مصنف کا احساس ہے کہ مسلمانوں کی رواداری اور عیسائیوں کی عدم رواداری کے اظہار واثبات کے لیے بعض سیاسی واقعات کو تفصیل سے لکھنا ضروری تھا۔ (ص ۱۶) مصنف کے نزدیک رواداری کمزوری کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی، وہ لکھتے ہیں:

''مگر یہ بھی واضح رہے کہ اسلام رواداری، محبت، شایستگی، شرافت اور معقولیت کی تعلیم ضرورت دیتا ہے لیکن ایسی عاجزی اور مسکینی کی بھی تعلیم نہیں دیتا ہے کہ اس کے پیرو ظالم کے لیے بن کر رہ جائیں، جو لوگ ظالم کا رویہ اختیار کریں ان کے ساتھ ان کے ظلم کی نوعیت کے لحاظ سے ان کا مقابلہ کرنے کی بھی تلقین کی گئی ہے، ظالموں کے مقابلہ میں نرم وشیریں بننا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ ایسے ظالم شرافت کو کمزوری اور مسکنت تصور کرنے لگیں گے، اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔ (پارہ ۲۱، سورہ ۲۹، آیت: ۴۶)'' (ص ۱۷)

اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے:

''آخر میں یہ کہنا ہے کہ جب انسانیت سنورتی نظر آئے گی اور لوگوں کو آنکھوں پر سے تعصب، نفرت، عداوت اور حقارت کی عینکیں اتر جائیں گی تو ان کو محسوس ہوگا کہ اسلام کی تعلیمات دنیا کے لیے ابر رحمت تھیں، ان کے سچے پیروؤں نے اپنی عملی زندگی میں انسانی ہمدردی، رواداری، فراخ دلی اور سیر چشمی کی جو مثالیں پیش کیں، ان ہی میں دنیا کی فلاح و بہبود کا راز مضمر ہے، ابھی اس حقیقت کو دریافت کرنے کا شاید وقت نہیں آیا ہے لیکن جب یہ حقیقت دریافت ہوجائے گی تو دنیا کا انسان اپنے کو از سر نو دریافت کرنے میں کامیاب ہوجائے گا''۔ (ص ۱۷)

مصنف نے ابتدا میں ص ۷ سے ۱۷ تک دیباچہ رقم کیا ہے جس میں انھوں نے موضوع کا بہت خوبصورت اور جامع تعارف کرایا ہے، اس دیباچہ میں ہی انھوں نے ٹی، ڈبلیو آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام سے ایسے اقتباسات نقل کیے ہیں جو عیسائی مورخین کے ایسے دعوؤں کو مسترد کرتے ہیں کہ اسلام عدمِ رواداری کی تعلیم دیتا ہے، مسلم حکمرانوں کے دور میں نئے گرجوں کی تعمیر ممکن نہیں تھی بلکہ قدیم گرجے بھی مسمار کیے جاتے رہے، انہوں نے اس بحث میں ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا ایک اقتباس نقل کیا ہے:

''حکومت اسلامیہ میں عیسائیوں کو جو مذہبی آزادی میسر آئی تو ایشیائے کوچک کے عیسائیوں کو بھی اسی زمانہ میں اس کا خیال پیدا ہوا اور سلجوقی ترکوں کے آنے کو عیسائیوں نے اپنے حق میں مفید جانا کہ عیسائی حکومت سے وہ ہم کو رہا کریں گے یعنی محصول ہی کی سختیوں سے نہیں بلکہ کلیسائے یونان کی عقوبت پسند خصلتوں سے بھی نجات ملے گی، جس نے منحرف فرقے پالیسین اور آئیکا نوکلاسٹ پر سخت ظلم کیے تھے، چنانچہ میکائیل ہشتم (۱۲۶۱ء-۱۲۸۲ء) کے زمانہ میں وسط ایشائے کوچک کے باشندوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ چھوٹے شہروں پر قبضہ کرلیں تاکہ رعایا کو عیسائی سلطنت کے ظلم سے نجات ملے، اکثر امیر وغریب وطن ترک کرکے ترکوں کی عمل داری میں چلے آتے تھے۔ایضاً ص ۱۱۱)''۔(ص ۱۴)

اس دیباچہ کے بعد اسلام میں مذہبی رواداری کے عنوان سے تمہید ہے، جس میں مصنف نے بڑے خوبصورت پیرائے میں اسلام کی بعثت کے مقصد، اس کی کامیابی کے راز، اس کی انسانیت نوازی اور اس کی صفت رحمت کی وضاحت کی ہے، اس تمہید میں انھوں نے اپنی گفتگو کو قرآنی آیات احادیث اور عیسائی مورخین کی عبارتوں سے مدلل بنا کر پیش کیا ہے۔ان کا یہ حقیقت پسندانہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''ہمارا اصلی مسلک تو یہ ہے کہ ہم انسانیت کو سنوارنے کے لیے اس دنیا میں ہیں، ہمارا رب رب العالمین ہے، اس کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ رحمٰن ورحیم ہے، اس کے کلام کا سرعنوان ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے، اس کی پہلی سورہ الحمدللہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتی ہے، اس کی تین سو سے زیادہ آیتوں میں اس کی صفت رحمت کا ذکر ہے، وہ غفور ہے، وہ تواب ہے، وہ ذوالرحمۃ ہے، وہ خیرالراحمین ہے، وہ کریم ہے، وہ حلیم ہے، وہ حفیظ ہے، وہ ستار ہے، وہ غفار ہے، وہ ذوالجلال والاکرام ہے، ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے ہیں، تو پھر رحیمی، کریمی، حلیمی اور ستاری سے انحراف کرنا اپنے ایمان میں خلل ڈالنا ہے، ہمارا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کے لیے رحمت اس لیے بھی ہیں کہ ہم رحمۃ للعالمین کے پیرو ہیں''۔(ص ۲۱)

مذہبی رواداری اور اسلام کی کامیابی کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے، مارگولتھ جیسے متعصب مورخ اور ایچ جی ویلس کے اقتباسات نقل کیے ہیں، مصنف کی باکمال نظر کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں ان دونوں اقتباسات کا نقل کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے:

''محمد کا سیاسی کام آپ کی موت کے وقت ادھورا نہیں تھا، آپ نے ایک امپائر قائم کردیا تھا، جس کے مذہبی اور سیاسی دونوں دارالسلطنت تھے، آپ نے بکھرے ہوئے قبیلوں کو ایک قوم بنادیا، ان کو ایک مذہب دے کر ایک مرکز اتحاد عطا کیا، اور ان میں ایسی یگانگت پیدا کردی تھی جس میں ایک خاندان سے زیادہ پائداری تھی، پرانے معتقدات جو عرصہ دراز سے چلے آرہے تھے، ان کی وجہ سے عرب الگ تھلگ ہوکر رہ گیا تھا لیکن یہ سب اپنی موت مرگئے، ان کی بعض باتیں تو لے لی گئی تھیں لیکن ان کے سارے نام قطعی طور پر ختم ہوگئے، گرچہ محمد ﷺ وفات پاگئے ہیں لیکن محمد ﷺ کا اللہ وفات نہیں پاسکا ہے۔محمد ص ۴۷۲-۴۷۱)۔ایچ جی ویلس رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا منکر ہے لیکن اسلام کی ترقی کا تجزیہ

کرنے میں اس کو لکھنا پڑا کہ ''یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام میں بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تعلیمات ہیں، جب اس کی تبلیغ شروع ہوئی تو معاشرہ میں ظلم وستم کا دور دورہ تھا جس سے سوسائٹی دب کر رہ گئی تھی، اسلام میں ایک ایسا معاشرتی نظام پیش کیا، جس سے معاشرتی ستم آرائی ختم ہوگئی، اسلام کے معاشرہ میں لطف، مہر اور محبت ہے، یہی ایک تنہا خصوصیت نہیں بلکہ قرآن کے ذریعہ سے اس نے توحید کا جو تخیل پیش کیا وہ یہودیوں سے بالکل مختلف تھا، عیسائیت نے اس تخیل کو اتنا گنجلک بنا دیا کہ اس سے نہ صرف تفرقہ پیدا ہوتا گیا بلکہ حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات کی اسپرٹ جاتی رہی، اسلام میں عبادت کرنے کا جو نظام ہے، وہ بھی اس کی قوت ہے پھر اس میں مکہ کو جو اہمیت دی گئی ہے اس سے بھی اس کی شان میں اضافہ ہوا، یہ نیا مذہب وہی ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں عیسائیت یا گوتم بدھ کی زندگی میں بودھ مت تھا، اسلام میں بڑے بڑے علماء وفضلاء اساتذہ اور مبلغین ہوئے، لیکن ان میں پادری نہیں ہوئے''۔(۱۸-۱۹)

اس کے بعد کا عنوان ہے تبلیغ اسلام کی نوعیت، اس عنوان کے تحت مختصراً اسلام کی تبلیغ کی مرحلہ واریت کو بیان کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں زور اور زبردستی کا کیا سوال جبکہ اس کی ابتدا خود ہی مظلومیت اور بے کسی کے حال میں ہوئی مشرکین اور یہود ونصاری سب ہی اس کے مخالف تھے، مصنف نے تبلیغ میں آلام ومصائب کے عنوان سے اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مصیبتوں کا ذکر کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا کو نقل کرکے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ اس دعا کے الفاظ سے جو عجز وانکساری کا اظہار ہو رہا ہے اس کے پیش نظر سمجھا جا سکتا ہے کہ اپنی تبلیغی مہم میں رسول اللہ کے لیے زور وزبردستی کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا، اس ضمن میں آپؐ کے جاں نثار صحابہ اور اولین مرحلے میں اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم ومصائب کا مختصر وجامع تذکرہ کیا ہے اور پھر یہ حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے:

''یہ تفصیلات پہلی دفعہ پیش نہیں کی جاری ہیں، اسلام کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے عام ہیں، ان کو یہاں پر مختصر طریقہ سے دہرانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارے ناظرین کے سامنے ایک بار پھر یہ حقیقت سامنے آجائے کہ ظالم، قاہر، جابر اور عدم رواداری کون تھا اور کون مظلوم، مقہور، مجبور اور رواداری بن کر رہا، تشدد کس طرف سے ہوا اور عدم تشدد کس نے اپنا وطیرہ بنایا، نہتا کون تھا، اسلام زور وجبر اور سختی سے پھیلا یا ایثار، قربانی، امن پسندی، صلح جوئی، بے سروسامانی، پرامن تبلیغ، جذبۂ فدائیت، صبر، تحمل، بردباری اور رواداری سے بڑھا اور بڑھتا گیا''۔(ص۳۳-۳۴)

آگے ہجرت کا مختصر تذکرہ ہے، پھر ایک بحث غزوات جارحانہ تھے یا مدافعانہ اس موضوع پر کی گئی ہے، اس بحث کی ابتدا میں ہی مصنف نے یہ فیصلہ کن اور حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے کہ:

''آیندہ صفحات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کے خلاف تلواریں اٹھیں تو اسلام کے نیام سے بھی تلواریں نکل پڑیں''۔(ص۳۵)

جنگ بدر کی تفصیلات لکھتے ہوئے انھوں نے میدان بدر میں مانگی گئی آنحضرت کی دعاؤں سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ دعائیں بتا رہی ہیں کہ آپ محض مدافعانہ جنگ

لڑنے کے لئے تیار ہوئے تھے، اس جنگ میں کفار کو بہر حال شکست ہوئی، دشمنان اسلام میدان جنگ سے قید ہوکر آئے مگر ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ مصنف کے قلم سے پڑھنے کے لائق ہے:

''جنگ بدر کے خاتمہ کے بعد دشمنان اسلام اسیرانِ جنگ بن کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ نفس رواداری کی اعلیٰ مثال ہے، یہ قیدی دو دو چار چار کرکے صحابہ کو تقسیم کر دئے گئے، آپ نے تاکید فرمائی کہ وہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں، صحابہ نے اس حکم کی تعمیل کی، وہ خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے مگر ان کو پورا کھانا کھلاتے، ان قیدیوں میں ابوعزیز کا بیان ہے کہ انصار جب صبح یا شام کو ان کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھے دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے، مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھ کو واپس دے دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت ﷺ نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے (طبری ص ۱۳۳۸ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۰۵) آخر میں آپ نے ان قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا اور مکہ واپس جانے کی اجازت دے دی، ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جا سکتی تھی اور اگر وہ قبول نہ کرتے تو ان کو قتل کیا جا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا۔'' (ص ۳۹)

ظاہر ہے کہ اس شکست کے بعد غیر مسلموں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی جس کے نتیجہ میں غزوہ سویق پیش آیا جس کا مختصر ذکر کرتے ہوئے مصنف نے واضح کیا ہے کہ یہ جارحانہ نہیں بلکہ مدافعانہ تھا، پھر غزوہ احد کا ذکر ہے، جس کی تفصیلات کفار مکہ کے جذبہ انتقام اور غیض و غضب کو ظاہر کرتی ہیں، اس جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے اسلامی رواداری اور مسلمانوں کے محاسن کا یوں تذکرہ کیا ہے:

''یہاں پر یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابودجانہ کو لڑنے کے لیے ایک تلوار دی تھی، وہ لڑائی میں ایک غیر مسلم عورت کے پاس پہونچے جو اسی قسم کے اشعار پڑھ کر غیر مسلموں کو غیرت دلا رہی تھی، ابودجانہ نے اس کو مارنے کے لیے تلوار اٹھائی مگر پھر رک گئے، جب ان سے پوچھا گیا کہ انھوں نے عورت پر تلوار اٹھا کر اپنی کارگزاری کیوں نہیں دکھائی تو بولے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار کو اس سے برتر سمجھا کہ اس سے عورت کو قتل کروں (تاریخ طبری ج ۱ حصہ سوم، اردو ترجمہ ص ۲۴۹، عربی ص ۱۳۹۰) مگر دوسری طرف سے یہ نمونہ پیش ہوا کہ لڑائی کے بعد غیر مسلم عورتوں نے مسلمان شہداء کے کان ناک کاٹ لیے، ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے ان کا ہار بنا کر پہنا اور حضرت حمزہؓ کا کلیجہ نکال کر چبا گئی، آخر یہ غیر مسلم کس مذہب کے پابند تھے، یہ سفاکانہ سلوک ان کے مذہب کی کس تعلیم پر محمول کیا جائے۔ اس کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کا جو اسوہ اس جنگ میں رہا وہ انسانیت کو سنوارنے کے لیے ایک پیام ہے، قریش بہت ہی غضب ناک ہوکر لڑ رہے تھے، غیظ وغضب میں آپ پر بھی تیروں کی بوچھار کرنے لگے، اس وقت ان کو برا کہنے کے بجائے آپ کی زبان مبارک سے صرف یہ نکلا کہ اے اللہ میری قوم کو بخش دے۔ وہ جانتے نہیں اور جب دشمنوں کا حملہ اور تیز تر ہوگیا تو غیرت کے

لہجہ میں آپ کی زبان مبارک سے یہ حسرت ناک الفاظ نکلے کہ وہ قوم کیا فلاح پاسکتی ہے جو اپنے پیغمبر کو زخمی کرتی ہے، یہ آہ بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی جس کے بعد یہ آیت اتری: لیس لك من الامر شیء (آل عمران:۱۲۸) (ترجمہ: تم کو اس معاملہ میں کچھ اختیار نہیں۔)'' (ص۴۱)

اس کے بعد دیگر جنگی کارروائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے اسلام کی مذہبی رواداری کے نتائج کو رقم کیا ہے تا آنکہ صلح حدیبیہ کا ذکر پھر غزوہ موتہ اور پھر فتح مکہ کا ذکر ہے، فتح مکہ کے وقت اخلاق کریمانہ اور انسانیت نوازی وعفو درگزر کی جو نظیر دنیا نے دیکھی اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے، صاحب کتاب اس موقع پر علامہ شبلیؒ کا ایک شاہکار اقتباس نقل کرتے ہیں:

''آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے، ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کو مٹانے میں سب کے پیش رو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آں حضرت کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایڑیوں کو لہولہان کردیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ آ کر ٹکراتا تھا، وہ بھی تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ رحمت عالم ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور خوف انگیز لہجے میں پوچھا: ''تم کو کچھ معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟'' وہ اگرچہ ظالم تھے، شقی تھے، بے رحم تھے، لیکن مزاج شناس تھے۔ پکار اُٹھے: ''تو شریف بھائی ہے اور شریف برادرزادہ ہے۔'' ارشاد ہوا: ''تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔'' کفار نے تمام مہاجرین کے مکانات پر قبضہ کرلیا تھا، اب وہ وقت تھا کہ ان کو ان کے حقوق دلائے جاتے، لیکن آپ نے مہاجرین کو حکم دیا کہ وہ اپنی مملوکات سے دستبردار ہوجائیں۔ (سیرۃ النبی، ج۱، ص۴۷۵)۔ کیا مذہبی رواداری کی اس سے بہتر مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں مل سکتی ہے؟ وحشی حضرت رسول اللہ ﷺ کے عزیز ترین چچا حضرت حمزہؓ کے قاتل تھے، وہ فتح مکہ کے بعد بھاگ کر طائف چلے گئے پھر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کو مسلمان تو کرلیا لیکن یہ بھی فرمایا کہ میرے سامنے نہ آیا کرنا کہ تم کو دیکھ کر مجھے چچا کی یاد آتی ہے۔ (صحیح بخاری قتل حمزہ، سیرۃ النبی ج۲، ص۳۶۲)۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی، اس نے حضرت حمزہؓ کا سینہ چاک کرکے ان کے دل وجگر کے ٹکڑے کیے تھے، فتح مکہ کے روز نقاب پوش ہوکر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور مسلمان بن کر امان کی سند حاصل کرلی، رسول اللہ ﷺ نے جب ہندہ کو پہچانا تو اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، ہندہ متاثر ہوکر بول اٹھی: یارسول اللہ! آپ کے خیمہ سے مبغوض تر کوئی خیمہ میری نگاہ میں نہ تھا لیکن اب آپ کے خیمہ سے زیادہ محبوب خیمہ میری نگاہ میں دوسرا نہیں''۔ (صحیح بخاری، ذکر ہندہ، سیرۃ النبی ج۲، ص۳۶۲)'' (ص۵۳-۵۴)

اس کے بعد اشاعت اسلام پر بحث کرتے ہوئے

واضح کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کے بعد بھی رسول اللہ کے پیش نظر صرف اور صرف تبلیغ رہی اور تبلیغی مشن کے لیے جو ممکن وسائل ہو سکتے تھے وہ اپنائے گئے، وفود بھیجے گئے، لوگوں کو متنبہ کیا گیا، وعیدیں سنائی گئیں، خوشخبریاں گوش گزار کی گئیں، نفرت و عداوت اور سخت گیری سے پرہیز کیا گیا، گویا اسلام کے اصول تبلیغ اور تبلیغی مرحلہ واریت کا پورا خیال رکھا گیا، اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے مصنف نے عنوان قائم کیا **تبلیغ کی کامیابی کا بڑا سبب**، اس عنوان کے تحت بڑے دوٹوک انداز میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ تبلیغ نبوی کی کامیابی کا بڑا سبب تائید الٰہی کے بعد آپ کا ارفع واعلیٰ اور پاکیزہ کردار تھا اس بات کا زمانہ معترف ہے کہ آپ کی زندگی کی جزوی تفصیلات کو بھی محفوظ کر لیا گیا ہے، صاحب کتاب اس حقیقت کو پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''آپ کے حسن اخلاق، حسن معاملہ، حسن سلوک، عدل، انصاف، عدم تشدد، مساوات، تواضع، راست گفتاری، ایفائے عہد، زہد، ورع، عفو، حلم، دشمنوں سے روادارانہ درگذر، لطف طبع، محبت عام اور رقیق القلبی کے جو نمونے ملتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی زندگی کو ایک آئیڈیل زندگی کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں''(ص۵۹)

آگے لکھتے ہیں:

''آپ نے اعلان کر رکھا تھا کہ خلوت میں مجھ میں جو کچھ دیکھو وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کرو اور جو رات کی تاریکی میں دیکھو وہ دن کی روشنی میں ظاہر کرو، جو بند کوٹھریوں میں دیکھو اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہدو، یہی وجہ ہے کہ آپ کے پیغام نے آپؐ کے پیرووں میں وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کو حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے سود ہے، حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو ان کے پیرو بھاگ گئے، ان کا دینی نشہ جاتا رہا اور وہ اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دئے، اس کے برعکس محمد ﷺ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد جمع ہوئے اور آپ کی مدافعت میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر تمام دشمنوں پر آپ کو غالب کر دیا''۔(ص۵۹)

یہاں پہنچ کر مصنف نے **رسول اللہ ﷺ کے پیرووں کی جاں نثاری** کا تذکرہ کیا ہے اور حضرت عیسی علیہ السلام کے متبعین سے متعلق ابتدا میں یہ لکھ گئے ہیں کہ وہ ''حضرت عیسیٰ کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے'' (ص۶۰) مگر واقعہ یہ ہے حضور کے ساتھیوں نے جو جاں نثاری کا ثبوت دیا اس کی مثال کسی اور مذہب کی تاریخ میں نہیں ملتی باوجود کہ سب اپنے اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، مصنف نے اس موقع پر مفید مثالیں پیش کرنے کے بعد ی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

''یہ جاں نثاری اور سرفروشی اسی وقت ممکن ہے جب دلوں پر حکمرانی کی جائے، یہ صحابہ کرامؓ زیادہ تر اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئے تھے لیکن آپ کی ذات مبارک سے ان کو جو گرویدگی اور شیفتگی پیدا ہوئی وہ اس روادارانہ محبت و شفقت کا جلوہ تھا جو ان کو آپ کی ذات مبارک میں ہر لمحہ اور ہر آن دکھائی دیتا، حضرت عمرؓ کی محبت میں تو ایسا والہانہ پن رہا کہ جب ۱۱ھ میں آپ ﷺ کا وصال ہوا اور اس کی خبر حضرت عمرؓ کو دی گئی تو انھوں نے اپنی تلوار کھینچ لی اور بولے کہ جو یہ کہے گا کہ آنحضرت نے وفات پائی تو اس کا سر اڑا دوں گا اور جب آپؐ کی میت کو غسل دیا جا رہا تھا تو حضرت علی

نے آپ کے جسم مبارک کو سینہ سے لگا رکھا تھا، یہ وارفتگی اور محبت اسی وقت ممکن ہے جب کوئی حبیب بن کر دوسروں کو محبوب رکھے و رمحبوب ہو کر دوسروں کا حبیب بنا رہے، یہ حبیبیت اور محبوبیت شمشیر وسنان سے نہیں بلکہ دلوں کی تسخیر ہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے''۔(ص۶۱)

اس کے بعد **اصلی اسلامی تعلیمات** کے عنوان کے تحت قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کے ماننے والوں نے قبول اسلام کے لیے کبھی زبردستی نہیں کی، آپ ﷺ نے پرامن لوگوں سے کوئی تعرض نہیں کیا، ان پر کوئی مذہبی دباؤ نہیں ڈالا، کبھی کسی قیدی پر اسلام لانے کے لیے جبر نہیں کیا، قرآن کی احسن طریقہ پر مدافعت کی ہدایت پر آپ ﷺ نے اس طرح عمل کیا کہ برائی کا دفاع بھلائی سے اور ظلم کا دفاع صبر سے کیا، جس کے نتیجہ میں آپ کے دشمن دوست بن گئے، نیکی اور بھلائی کی تبلیغ کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے اور تلواریں اٹھائی گئیں تو اس کا جس طرح دفاع کیا گیا وہ انسانی تاریخ کا نمونہ ہے۔

آسمانی کتابوں کی صداقت پر ایمان ایک مسلمان کے ایمان کا جزء ہے، جس کا حکم خود قرآن مجید نے دیا ہے، مصنف نے اسلام کی تعلیم کو اس کی منفرد خصوصیت قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ کسی دوسرے مذہب میں یہ رواداری اور بے تعصبی نہیں ملتی، یہ عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی علامت اور تعلیم ہے، اسی سلسلہ کو آگے بڑھاتے ہوئے **دنیا کی قوموں کے ساتھ رویہ** کا عنوان قائم کیا ہے، ان میں اہل کتاب، شبہ اہل کتاب اور کفار ومشرکین کا ذکر کرتے ہوئے ان کے ساتھ حسن سلوک کی اسلامی تعلیم کو پیش کیا ہے اور اس پر سورہ بقرہ کی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ لیس علیك هداهم ولكن الله يهدى من يشاء وما تنفقوا من خير فلانفسكم وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله وما تنفقوا من خير يوفّ اليكم وانتم لا تظلمون (بقرہ:۲۷۲) (ترجمہ: تیرا ذمہ ان کو راہ پر لے آنا نہیں ہے، اللہ راہ پر لے آتا ہے، جس کو چاہے اور جو تم دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر اور جو دو گے خیرات وہ تم کو پوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔)

اس کے بعد قرآن پاک نے انسانیت نوازی، فراخدلی اور رواداری کی جو تعلیمات دی ہیں ان پر نبی پاک ؐ کے عمل کو **رواداری میں رسول اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ** کے ذیل میں اختصار وجامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس ضمن میں مشہور احادیث کے ذکر پر اکتفا کی گئی ہے جیسے کہ ایک مرتبہ صحابہ نے مظالم سے تنگ آکر حضور ﷺ سے عرض کیا، آپ ان کے لیے بد دعا کیوں نہیں کرتے تو آپ ﷺ نے فرمایا میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے **یہود اور مسلمان** کی سرخی کے ذیل میں یہود کی اسلام دشمنی کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ فیصلے میں عدل کو ملحوظ رکھنے کے قرآنی حکم (مائدہ:۴۲) کو پیش کیا گیا ہے، اس قرآنی حکم کی اتباع میں یہود کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے ان کی بدترین اسلام دشمنی کے باوجود جس رواداری اور وسعت قلبی کا ثبوت دیا اس کو رسول اللہ ﷺ اور یہود کے عنوان کے تحت درج کیا گیا ہے، اس ضمن میں مدینہ اور اس کے اطراف میں رہنے والے یہودیوں کے معاہدوں اور ان کی شرارتوں کے باوجود ان سے رواداری کا تذکرہ کیا ہے، بنونضیر کی جلا وطنی کا قصہ بہت مشہور ہے، اس کے اسباب وخلفیہ کا ذکر کرنے کے بعد مولانا شبلی کی وصف نگاری کا یہ شاہکار نقل کیا ہے جس سے عہد شکنی کے باوجود رواداری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''بنونضیر اگرچہ وطن چھوڑ کر نکلے لیکن اس شان

سے نکلے کہ جشن کا دھوکا ہوتا تھا، اونٹوں پر سوار تھے ساتھ ساتھ باجا بجتا جاتا تھا، مطربہ عورتیں دف بجاتی اور گاتی تھیں، عروہ بن الورد مشہور شاعر کی بیوی کو یہود نے خرید لیا تھا وہ بھی ساتھ ساتھ تھی، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ اس سروسامان کی سواری بھی ان کی نظر سے نہیں گذری تھی، ہتھیاروں کا ذخیرہ جو ان لوگوں نے چھوڑا اس میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں، ان کے جانے کے بعد یہ جھگڑا پیش آیا کہ انصار کی اولاد جنھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا اور یہودی ان کو اتحاد مذہب کی وجہ سے ساتھ لیے جاتے تھے، انصار نے ان کو روک لیا کہ ہم ان کو نہ جانے دیں گے، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری لا اکراہ فی الدین (بقرہ:۲۵۰) یعنی مذہب میں زبردستی نہیں۔" (ص۷۲)

اس سلسلہ میں انھوں نے قدرے تفصیل سے حضور ﷺ کی بعض عملی مثالیں ذکر کی ہیں، کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اور موضوع کا احاطہ کرنے کی مصنف نے جو خوبصورت کوشش کی ہے اس کے اظہار کے لیے اس بحث کے بعض اور اقتباسات درج کیے جاتے ہیں:

"قرآن مجید میں یہودیوں کی بد طینتی اور بدکرداری کے متعلق جو کچھ کہا گیا تھا، رسول اللہ ﷺ کو اپنی عملی زندگی میں اس کا عملی ثبوت ملتا رہا مگر آپ ﷺ کا دل یہودیوں کے برے برتاؤ کے باوجود سخت ہونے کے بجائے نرم رہا، آپ ﷺ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ بھی دیا، حضرت صفیہ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا تو اس میں آپ ﷺ نے کوئی مزاحمت نہیں فرمائی۔ (سیرۃ النبی ج۶،ص۲۴۱)۔ آپ ﷺ نے ہمسایہ کا حق ادا کرنے کی جو تلقین کی اس میں یہودی اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں رکھی اور آپ ﷺ کی اس تعلیم پر صحابہ کرامؓ برابر عمل کرتے رہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی، ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انھوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا؟ کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریل ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے تھے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنادیں گے۔ (ابوداود کتاب الادب، باب فی حق الجوار، سیرۃ النبی ج۶، ۲۸۶)۔ ایک دفعہ ایک یہودی نے برسرِ بازار کہا قسم اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انبیا پر فضیلت دی، ایک صحابیؓ نے یہ سن کر پوچھا: محمد ﷺ پر بھی؟، اس نے کہا: ان پر بھی، صحابیؓ نے غصہ میں اس کو ایک تھپڑ ماردیا، آنحضرت ﷺ کے عدل وانصاف کی شہرت تھی وہ یہودی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صحابی کی شکایت کی، آپ ﷺ نے صحابیؓ پر برہمی ظاہر فرمائی۔ (صحیح بخاری، سیرۃ النبی ﷺ ج۲، ص۳۷۰)" (ص۷۷)

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اور عیسائی کے باب میں عیسائیوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کے مشفقانہ اور روادارانہ سلوک کی تصویرکشی کی ہے، یہ بھی واقعہ ہے کہ آپ ﷺ کی کوئی لڑائی عیسائیوں کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ ان کے ساتھ معاہدے ہوتے رہے، آپ ﷺ کی طرف سے عیسائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ انسان دوستی اور مذہبی رواداری کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔

دعوتی خطوط میں نرمی کو عنوان بنا کر مصنف نے تبلیغ

میں نرمی برتنے کی اسلامی تعلیم اور آپ ﷺ کی عملی کوشش کی عمدہ مثال پیش کی ہے، ساتھ ہی اُس دور میں جبکہ سفراء کے قتل کی روایت عام تھی آپ ﷺ کے ذریعہ سفراء کے ساتھ نرمی کی تلقین کو پیش کیا ہے اور **سفراء کے ساتھ رواداری** کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کے سلوک کو پیش کیا ہے۔

اس کے بعد جو عنوان قائم کیا گیا ہے وہ انتہائی اہم ہے، **رواداری کا مفہوم** واضح ہونا انتہائی ضروری ہے، عام طور پر اس کو برتنے میں لوگ افراط وتفریط کا شکار ہوتے ہیں، مصنف کے مطابق ''رواداری قابل تعریف صفت ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی حال میں بھی رواداری سے انحراف نہ کیا جائے ''ص۸۳'' اس کے مفہوم کی وضاحت کے لیے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفت رحیمی وغفاری اور اس کے بالمقابل اس کی صفت قہاری کو اور اس کے عملی مظاہر کو پیش کیا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کی جامعیت کو پیش کیا ہے جہاں اخلاق کی نرمی مثالی ہے تو سرگرم شجاعانہ قوتوں کا خزانہ بھی ہے، اس میں کیا شک کہ اس دنیا میں نرمی وسختی دونوں کی ضرورت ہے، ساتھ ہی یہ بھی صاف کر دیا ہے کہ حضور ﷺ کی سختی اپنے ذاتی دشمنوں کے ساتھ نہیں ہوتی تھی بلکہ خدا کے دشمنوں کو وہ کبھی معاف نہ کرتے ان کو حق کی تلقین کرتے اور عذاب الٰہی سے ڈراتے تھے۔

مصنف نے **اسلام کی لڑائیاں** عنوان قائم کر کے پیغمبر اسلام کے ذریعہ لڑی جانے والی جنگوں کی حقیقت کو بیان کیا ہے، کہ ان جنگوں کی اجازت رسول اللہ ﷺ کو اس لیے دی گئی کہ آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے اصحاب پر صرف اس لیے ظلم کیا گیا اور اپنے گھروں سے نکالا گیا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے، جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا اور سکون سے رہنے نہیں دیتے اسی طرح جو لوگ نہ خود ایمان رکھتے تھے نہ دوسروں کو ایمان لانے دیتے تھے ان لوگوں کے خلاف بھی جنگ کی اجازت دی گئی اور سورہ حج کی آیت نمبر ۶ اور انفال کی آیت نمبر ۵ اور توبہ کی آیت نمبر ۴ میں اسکے احکام بیان کیے گئے ہیں، مصنف نے تاریخ میں لڑی جانے والی دیگر اقوام و مذاہب کی جنگوں سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے یہ لڑائیاں لڑی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جنگ وجدال کے لیے یہ لڑائیاں نمونہ بن سکتی ہیں، انھوں نے واضح کیا ہے کہ یہ لڑائیاں ذاتی شان وشوکت، ملک گیری یا جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے نہیں بلکہ اپنے دفاع اور حق و صداقت کی ترویج کے لیے لڑی گئیں، ان کا کہنا ہے کہ ''اگر اسلام نے حق وصداقت کی ترویج کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کیا تو اس پر شرمانے کی ضرورت بھی نہیں ص۸۶'' اس لیے کہ کوئی ملک وقوم ایسی نہیں جس کی تاریخ جنگوں سے خالی ہو بلکہ متمدن دنیا تو اس کی قائل ہے کہ انسانیت کے فروغ کے لیے جنگ لازمی ہے (ص۸۵) اپنے اس نقطۂ نظر کی خاطر مغرب نے دنیا بھر میں جو تباہی مچائی ہے وہ ہمارے سامنے کا واقعہ اور مشاہدہ ہے۔

مصنف نے جنگ کے اس مبحث کو آگے بڑھاتے ہوئے **انسانیت کو اسلام کا پیغام** سنانے کی سعی مشکور کی ہے، اس ضمن میں انھوں نے واضح کیا ہے کہ فلاح ونجات کا مدار ایمان ہے، اور ایمان کے بعد پھر اخلاق کو سنوارنے کی تفصیل بیان کی ہے، اور یہ واضح کیا ہے کہ ''اخلاق کی خوبی اس کے علم و فلسفے میں نہیں بلکہ اس کے عمل میں ہے، اخلاق کی غرض وغایت یہ ہے کہ ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہو ص۸۷'' مصنف نے نہایت اختصار و جامعیت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اسلام میں اخلاق سے متعلق سارے فضائل کی تلقین کی گئی ہے اور سارے رذائل کو مذموم قرار دیا گیا ہے، اس بحث کے آخر میں انھوں نے نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ **انسانیت کو سنوارنے کے لیے لڑائیاں** بھی اسلام کے ماننے والوں کو لڑنی پڑیں جو ان لوگوں کے خلاف لڑی گئیں جو اخلاق کو سنوارنے

اورانسانیت کو بچانے کی راہ میں رکاوٹیں بن رہے تھے، یہاں پہنچ کر مصنف نے جوسطریں رقم کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں ان سطروں سے جہاد کی نوعیت ومعنویت بھی واضح ہوتی ہے، لکھتے ہیں:

''اسلام میں اخلاق کے سارے فضائل کی تلقین اور سارے رذائل کی مذمت کی گئی ہے، کیا یہ تعلیمات صرف مسلمانوں کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ہیں یا ان سے دوامی فیضان حاصل کر کے ساری انسانیت سنواری جاسکتی ہے تو ان تعلیمات سے انحراف یا انکار کرنے کا نام کفر ہے اور اس کفر کو دبانے اور مٹانے میں جولوگ رکاوٹ پیدا کریں ان کے خلاف جنگ کی جائے تو کیا یہ عدم رواداری کا ثبوت ہوگا یا ایسی لڑائیوں سے انسانیت کی گردن پر احسانات کا ایک بڑا بوجھ ڈال دیا جائے گا، انسانیت کی گردن پر احسانات کے بوجھ ڈال دینے کا نام ہی جہاد ہے'' (ص۸۹)

مصنف نے اس کے بعد بڑی منطقی بحث **لڑائیوں کے لیے اسلامی قانون جنگ وصلح** کے عنوان سے کی ہے اور بجا فرمایا ہے کہ ان ضوابط وقوانین پر انسانیت فخر کرسکتی ہے، مصنف نے ان قوانین اور عالمی قوانین جنگ وصلح کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے تحدی کے لہجہ میں بجا کہا ہے، کیا اقوام متحدہ اس سے بہتر قوانین پیش کرسکتی ہے، اس کے بعد دور حاضر کے سب سے قابل اعتراض لفظ **جہاد** پر گفتگو کی ہے اور دونوں جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور ہولناکیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ ''جہاد بڑا قابل اعتراض لفظ سمجھا جاتا ہے مگر اس پر اعتراض کرنے والے وہی لوگ ہیں جو ایسی جنگ لڑنے کے عادی ہو چکے ہیں جس میں غارت گری، خوں ریزی اور درندگی کی ہولناک ترین مثالیں ملتی ہیں، ص۹۴''

مصنف نے **سپہ سالاری کا مثالی نمونہ** عنوان قائم کیا ہے، اور اس کے تحت رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور جنگوں سے متعلق آپ ﷺ کی ہدات کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے، آپ ﷺ کے بعد پھر صحابہ کرام کی قیادت کا دور شروع ہوتا ہے، ظاہر ہے وہ آپ ﷺ ہی کے تربیت یافتہ افراد تھے اس لیے وہ پوری طرح آپ ہی کی تعلیمات پر عمل پیرا رہے، اس ضمن میں مصنف نے **صحابہ کا اسوۂ حسنہ** پیش کرنے کے لیے **حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رواداری** کا عنوان قائم کیا ہے، حضرت صدیق اکبرؓ کی انکساری وتواضع بہت مشہور ہے، ان کی ان کریمانہ خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے ان کے پہلے خطبہ کا ذکر کیا ہے اور اس میں کمزور کو طاقتور سے حق دلانے کے عہد کے ذکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس خطبہ پر **حقوق انسانی کی حمایت** کا دلچسپ عنوان لگایا ہے، پھر **عفو ودرگزر کی مثالیں** پیش کی ہیں، **غیر مسلموں کے حقوق کی نگہبانی** کے متعلق ان کی ہدایات اور ان کے عہد خلافت کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے بالخصوص **نجران کے عیسائیوں کو مراعات** کا تذکرہ کیا ہے اور **عہد صدیقی میں عیسائی مذہب کا احترام** جس طرح کیا گیا اس پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کے بعد بالترتیب حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی رواداری کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت عمرؓ کی سخت گیری اور دینی غیرت وحمیت بہت معروف ہے، مصنف نے قدرے تفصیل سے ان کے عہد میں پیش آنے والے ایسے واقعات کا جائزہ لیا ہے جو اسلام کی روادارانہ طبیعت کے عکاس ہیں، چونکہ حضرت عمرؓ کے عہد میں مملکت اسلامیہ کو بڑی وسعت ملی تھی، متعدد شہر اور ملک اسلام کے زیر نگیں آگئے تھے بلکہ رفتہ رفتہ وہاں کی اکثر آبادی مسلمان ہوتی گئی اور وہ اسلامی ممالک کہلانے لگے، مصنف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور پھر اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے

کہ عراق، شام، مصر اور ایران کے سارے علاقے کی آبادی رفتہ رفتہ اسلام اس طرح قبول کرتی گئی کہ ان میں مسلمانوں کی اکثریت بڑھتی گئی اور وہ اسلامی ممالک کہلانے لگے، یہاں مسلمان اپنے رواداران کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش نہ کرتے تو ان کا اسلام کی طرف مائل ہونا کیسے ممکن تھا، تھوڑے سے لوگوں پر تو جبر اور دباؤ ڈالا جاسکتا ہے مگر پورے علاقے کو زور اور چیرہ دستی سے کسی مذہب کی طرف مائل کرنا انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے۔'' (ص ۱۱۳)

رواداری کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات اور رسول اللہ وخلفائے راشدین کے ان پر تعامل کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنے کے بعد مصنف نے بات کو سمیٹتے ہوئے بے لاگ اور منصفانہ بات کہی ہے:۔

''اسلام کی تعلیمات وہی ہیں جو قرآن مجید اور حدیث شریف میں ہیں یا جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ یا خلفائے راشدین کے حالات کا سلسلہ میں پائی جاتی ہیں، ان کے خلاف اگر کسی مسلمان فاتح یا حکمراں نے کچھ کیا تو وہ اس کا ذاتی فعل تھا جو سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف تھا''۔ (ص ۱۱۸)

اس کے بعد مصنف نے **عیسائیوں کی عدم رواداری** کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ ان صفحات میں صرف عیسائیوں کی عدم رواداری کا مسلمانوں کی رواداری سے موازنہ کرنے کے لیے جھلکیاں ہی دکھانا چاہیں گے، ورنہ عیسائیوں کے مظالم کو سمیٹا جائے تو ضخیم جلدیں تیار ہوجائیں گی، اس سلسلہ میں انھوں نے سب سے پہلے **رومۃ الکبری کی عدم رواداری** کی جھلکیاں دکھانے کی کوشش کی ہے، رومن امپائر کی قوت وشوکت پر عیسائی فخر کریں تو بجا مگر اس کے مظالم کی داستان اتنی شرمناک ہے کہ خود منصف مزاج عیسائی مؤرخین نے ان کا انتہائی افسوس وشرم کے ساتھ ذکر کیا ہے، مصنف نے پہلے اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ رومن امپائر نے عیسائیت کو سرکاری مذہب تو بنایا لیکن مذہب کو اپنی بولہوسی اور اقتدار کے لیے استعمال کیا، جس کے نتیجہ میں کلیسا بھی شہنشاہیت کا خواب دیکھنے لگا اور پھر بیسیوں فرقے وجود میں آئے اور یہ امپائر تقسیم ہوتی رہی، رومن امپائر نے انسانوں پر جو مظالم ڈھائے وہ انسانیت سوزی کی بدترین مثال ہیں، عیسائی مصنفین کے حوالے سے مصنف نے اس کا جامع نقشہ کھینچا ہے، اس کے بعد **ساتویں صدی عیسوی میں عیسائیوں کے مظالم** کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ وضاحت کی گئی ہے کہ رومی شہنشاہوں کی جو سیہ کاریاں اور بدعنوانیاں اور کمزوریاں سرسری طور پر بیان کی گئیں وہ آگے چل کر شاہانہ سطوت وعظمت کی روایتیں بن گئیں۔

اس شرمناک وخوفناک بحث کے بعد **اسلام کے عروج** کا ذکر کرتے ہوئے صاحب کتاب نے لکھا ہے کہ جب انسانیت دم توڑ رہی تھی تو اسلام نے اس کو سہارا دیا، اخوت ومحبت اور ہمدردی ورواداری کی مثال قائم کی، رسول اللہ اور خلفائے راشدین نے عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک کیا، لیکن اس کے برخلاف عیسائی سات سو برس تک مسلمانوں کی بیخ کنی کی کوشش کرتے رہے، یہاں مصنف نے اسی پس منظر میں مسلمانوں کی رواداری اور عیسائیوں کی عدم رواداری کے مابین موازنے کی کوشش کی ہے، اس کے لیے انھوں نے **خلافت راشدہ اور رومی** کا عنوان قائم کیا ہے، اور خلفائے راشدین کے زمانے کی فتوحات، رومیوں کا غرور اور مسلسل ان کی کارروائیوں کے تذکرے کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری ان کے اخلاق کریمانہ اور بے نفسی و بے ثباتی اور سادگی کا تذکرہ کیا ہے۔ (جاری.....)

☆☆☆

❑ فکر و نظر

راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

تاریخ کے سفر میں مسلمانوں کی گاڑی ہندوستان میں جس دلدل میں پھنس گئی ہے اس کا اندازہ ہر باشعور مسلمان کو ہے ۔ایسا نہیں ہے کہ دوسرے ملکوں میں مسلمانوں کوکوئی شکایت نہیں ہے اور وہاں راوی چین ہی چین لکھتا ہے،فرق یہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کے وجود اور تشخص کو خطرہ درپیش نہیں ہے وہاں جمہوری حقوق معرض خطر میں ہیں اور یہاں یعنی اس ملک میں جان ومال اورآبرو اور مذہبی تشخص اوران کے تعلیمی اداروں کا اقلیتی کیریکٹر خطرہ میں ہے، ماب لنچنگ ،فرقہ وارانہ فسادات۔مسلمانوں کے لئے اپنی کشتی جان کو سلامت لے جانا مشکل ہورہا ہے۔ اسکولوں میں سوریہ نمسکار کا لزوم ہورہا ہے، جب کہ یہ ہندو مت کی مذہبی عبادت ہے اور اس میں سورج کے دیوتا ہونے کا تصور ہے۔مسلمان اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے اس عبادت میں شریک ہوہی نہیں سکتا ہے ۔اس ملک میں سیکولر اور انصاف پسند ہندو روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں اور ہندتو کا نظریہ غالب آتا جارہا ہے۔عہد ستم طویل ہوتا جاہا ہے،کشمیر سے کنیا کماری تک ہنگامہ آہ وفغاں ہے وہ موج خوں ہے جو فصیل جاں تک آ پہنچی ہے،مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انہیں ابھی تک تمیز رہبر ورہزن نہیں۔’’چلتے ہیں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ‘‘۔وہ راہبر کو پہچانتے نہیں ہیں۔

مسلمانوں کو آخری مہلت ملی ہے’’کرو یا مرو‘‘ کی صورت حال سے سابقہ ہے۔مسلمانوں کی اکثریت بے حسی اور بے شعوری کی حالت میں گرفتار ہے ان کے قائدین میں بھی شعور کی کمی ہے اور جو لوگ باشعور ہیں ان کے سامنے راستہ واضح نہیں ہے۔علماء اور دانشوروں کے سامنے بھی سوالیہ نشان ہے کہ’’پس چہ باید کرد‘‘؟۔ بس گنتی کے چندلوگ ہیں جو کسی نظریہ اور حل پر ایمان و ایقان رکھتے ہیں ۔اور صرف ان کو دیکھ کر یہ پڑھنے کا جی چاہتا ہے’’ ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی‘‘۔

حل کیا ہے یعنی مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کیسے ممکن ہے تو اس حفاظت کے کام کے دو محاذ ہیں: ایک تو داخلی محاذ ہے جس کا ذکر تحریر وتقریر میں بہت آتا ہے اور جس میں کسی’’امام‘‘ کا اور کسی مسلک کا کوئی اختلاف نہیں اور اس داخلی محاذ کے عنوانات ہیں ۱۔باہمی اتحاد و اتفاق ۲۔ایمان واخلاق کی مضبوطی اور اللہ سے تعلق ۳۔تعلیم میں تفوق اور ہنرمندی تاکہ ہماری ملت کا کوئی

شخص بے علم اور بے ہنر نہ رہ جائے ۴۔محنت اور جفاکشی کی عادت، اچھی صحت اور حفاظت خود اختیاری وغیرہ۔

ملت کی حفاظت کے کام کا دوسرا محاذ خارجی محاذ ہے اور یہی وہ محاذ ہے جس کے بارے میں ذہن صاف نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے مسلمانوں کی اپنی سیاسی پارٹی ہونی چاہئے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی سیکولر پارٹیوں میں شامل ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ زیادہ تر اسی خارجی محاذ سے متعلق ہے بالفاظ دیگر یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کے سلسلہ میں ہمارا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ تعلیم وہنر واخلاق واتحاد کے سوااور داخلی محاذ کے علاوہ ہماری جدوجہد کا رخ کیا ہو کیونکہ تعلیم کے باوجود تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ نا انصافی ہوتی ہے، اتحاد واتفاق کے باوجود ہمارے شہر کو شہر خموشاں بنایا جاتا ہے مذہب واخلاق پر عمل کے باوجود ہماری مسجدوں پر قبضہ غاصبانہ ہوتا ہے دینداری کے باوجود جراحتوں کے چمن کھل اٹھتے ہیں، اس وقت ملت کا ہر لالہ، لالہ خونیں کفن ہے۔ سوال ہے کہ اب ملت کی آبرو کیسے بچائی جائے ظلم اور ناانصافی سے اسے کیسے نجات ملے ؟

سچ یہ ہے کہ صرف ایک حل باقی بچا ہے اور وہ ہے برادران وطن سے ماس کنٹیکٹ یعنی ہندوؤں سے رابطہ عامہ اور ان کے دلوں کو جیتنا ''جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ'' یہ وہ حل ہے جس کی طرف علماء اور قائدین میں سے کسی کی نظر گئی ہے تو صرف مولانا ابوالحسن علی ندوی کی گئی ہے۔ آسمان ملت کا یہ وہ تنہا خورشید درخشاں ہے جس نے اپنی ضوفشانی سے راستہ دکھایا ہے۔ اگر اس راستہ پر مسلم قوم گامزن نہیں ہوئی تو وہ خون بہے گا کہ بیسوں برساتوں کے بعد بھی خون کے دھبے نہیں دھل سکیں گے اور بے داغ سبزے کی بہار کے لئے آنکھیں ترسیں گی۔ مولانا علی میاں نے ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والے طلبہ کو جو نصیحت کی تھی اسے ندوۃ العلماء کے آرگن ''تعمیر حیات'' نے چھاپ دیا ہے ان چار نصیحتوں میں چوتھی نصیحت یہ ہے:

'' چوتھی بات یہ ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے آپ حسن اخلاق اور سنجیدگی کا نمونہ پیش کریں ان کو اپنے آپ سے اور اپنے مذہب سے مانوس کریں'' (تعمیر حیات ۲۵ جولائی ۲۰۱۹ بعنوان چار باتیں اپنی زندگی میں شامل کر لیجئے)

مولانا نے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ ''یہ باتیں میں نے اس سے پہلے بھی کہی ہیں اور آج پھر کہتا ہوں کہ آپ کو اس وقت چار (۴) کام کرنے ہیں'' معلوم ہوا کہ مولانا مسلسل طلبہ کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے۔ میرے خیال میں ہندوستان کے کسی دارالعلوم میں وہاں کے ذمہ دار اس اہم پہلو کی طرف توجہ نہیں دلایا کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مسلم تنظیمیں مسلمانوں کو ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا کرتی ہیں اور سچ یہ کہ غیر مسلموں کو اسلام سے مانوس کرنا ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور ان کے دلوں میں حسن اخلاق کا نقش قائم کرنا واحد حل باقی رہ گیا ہے۔ اور اس کام کی مہلت بھی تھوڑی بچی ہے۔ آج یونیورسیٹیوں کے بعض عربک ڈپارٹمنٹ کے مسلم اساتذہ تک اپنا مستقبل ''روشن'' کرنے کے لئے بی جے

پی اور آر ایس ایس کے دفتروں کا چکر لگا رہے ہیں ''طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا'' گئی ساعتوں کی بات ہے، مولانا علی میاں کا قصہ حیات ہے، ایک بار وہ ٹرین سے سفر کر رہے تھے، ایک بوڑھی خاتون ٹرین پر سوار ہوئیں اور کہنے لگیں کہ میرا رزرویشن اوپر کی برتھ پر ہے اور میں معذور مجبور چڑھ نہیں سکتی۔ کوئی اللہ کا بندہ سیٹ بدل لے اور مجھے نیچے کی برتھ دے دے۔ بوڑھی عورت کی التجا پر کسی کا دل نہیں پسیجا۔ سب خاموش تھے مولانا اس عورت سے مخاطب ہوئے کہ ''بہن آپ پریشان نہ ہوں میں آپ کی اوپر کی برتھ لے لوں گا آپ میری نیچے کی برتھ لے لیں'' بعد میں مولانا سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ تو خود معذور تھے، یہ پیشکش کیوں کی۔ مولانا نے جواب دیا کہ ''اسلامی اخلاق کو پیش کرنے کا موقعہ ہمیشہ نہیں ملتا جب موقعہ ملے اسلامی اخلاق کو پیش کرنا چاہئے''۔

مولانا علی میاں ایک درویش ایک قلندر ایک صوفی باصفا تھے، اس زہد واتقاء کا تقاضا تھا کہ ہر وقت سبحہ وسجادہ کی مشغولیت اختیار کرتے، مولانا علی میاں ایک مصنف ادیب، صاحب قلم تھے، اس کا تقاضا تھا کہ ہر وقت قرطاس وقلم کی بساط سجا کر بیٹھتے اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہتے، لیکن وہ باشعور اور باخبر انسان بھی تھے انہیں محسوس ہوا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ برادران وطن سے قریب ہوا جائے اور ان کو خطاب کیا جائے ان سے رابطہ قائم کیا جائے، چنانچہ انہوں نے شہر شہر پیام انسانیت کے جلسے منعقد کئے۔ مولانا علی میاں نے جو حل سوچا تھا وہی حل آج بھی درست ہے۔ مولانا علی میاں نے ندوہ کے طلبہ کو جو نصیحت کی تھے اسی نصیحت کی پوری ملت اسلامیہ کو آج شدید ضرورت ہے اور یہی تمام مشکلات کی کلید ہے۔ مولانا علی میاں نے ندوہ کے کچھ طلبہ کو نصیحت کی تھی اور اگر یہی نصیحت تبلیغی جماعت حرز جاں بنالیتی اور غیر مسلموں کو مانوس کرنے اور حسن اخلاق سے متاثر کرنے کی کوشش کے کام کو اپنے چھ اصولوں میں سے اکرام مسلم کے اصول کے ساتھ شامل کر لیتی تو اس کے بہت اچھے اثرات ظاہر ہوتے، کیونکہ اس کا نٹ ورک ہندوستان اور اس کے باہر تک پھیلا ہوا ہے۔ مولانا علی میاں تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاس کے دست راست تھے اور مولانا الیاس پر ان کی ایک موثر اور مبسوط تصنیف موجود ہے، کاش تبلیغی جماعت کے لوگ اپنے بزرگ رہنما مولانا علی میاں کی نصیحت پر کان دھرتے اور پند پیر دانا پر عمل کرتے۔ ہندوستان کے دلفگار حالات میں مولانا علی میاں نے جو نصیحت کی اور نئے رخ پر کام کا جو نمونہ پیش کیا اس کی مثال نہ حال میں ملتی ہے نہ ماضی میں، نہ معاصرین میں نہ متقدمین میں، مولانا علی میاں اپنے خطبات میں، نگارشات میں اب بھی زندہ ہیں:

یہ نکتہ میں نے سیکھا بو الحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگ بدن سے

☆☆☆

❑ اصلاحیات

مسلمانوں کی پانچ بیماریاں

مولانا سید احمد ومیض ندوی
(استاذ حدیث دارالعلوم حیدرآباد)

پڑوسی مسلم ملک کے ایک معروف کالم نگار اپنے ملک میں موجود ایک یوروپی ملک کے سفیر سے گہرے مراسم رکھتے تھے۔ یوروپی ملک کا ان کا یہ سفیر دوست عام سفیروں کی طرح نہ تھا بلکہ سفیر کے ساتھ وہ ایک دانشور اور تجزیہ نگار بھی تھا۔ قوموں کے عروج وزوال کا مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ تھا، بقول ان کالم نگار کے ان کا سفیر دوست جب گفتگو کرتا اور دلائل دیتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ غبار چھٹ رہا ہے اور حقیقتیں ایک ایک کر کے سامنے آرہی ہیں۔ ماضی کے تجزیوں کی بنیاد پر وہ مستقبل کی ایسی پیشین گوئی کرتا کہ آنے والا زمانہ نظروں کے سامنے پھرنے لگتا۔ مذکورہ معروف کالم نگار نے اپنے یوروپی سفیر دوست کے ساتھ ہوئی آخری ملاقات کی تفصیلات اپنے ملک کے ایک روزنامے میں شائع کی ہے۔ چونکہ اس گفتگو میں اور مسلمانوں کے تعلق سے اس یوروپی سفیر کے تاثرات میں ہم سب مسلمانوں کے لئے غور وفکر کے ان گنت گوشے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہی کے الفاظ میں اس گفتگو کو من وعن نقل کر دیا جائے۔ کالم نگار موصوف تحریر کرتے ہیں:

''جس دن مجھے اطلاع ملی کہ طویل قیام کے بعد وہ یہاں سے واپس جارہا ہے اور انھیں فرائض منصبی کو اب کسی اور ملک میں سرانجام دے گا تو میں نے اس سے درخواست کی کہ روانگی سے پہلے میرے ہاں آئے اور کچھ وقت گزارے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہمارے ملک میں تم نے اتنے سال گزارے۔ مشاہدہ کیا۔ طول وعرض میں گھومے پھرے۔ شہر، قصبے اور قریے دیکھے عوام اور خواص سے ملاقاتیں کیں۔ سیاست داں، نوکر شاہی فوج سب کو قریب سے دیکھا، تم کس نتیجے پر پہنچے اور ہمارا مستقبل تمہیں کہاں اور کیسا نظر آرہا ہے؟ وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ میرے سوال کا جواب دینا پسند نہیں کرے گا۔ تاہم کچھ دیر کے بعد اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا:

''میں یہاں آنے سے پہلے بہت سے ملکوں میں رہا۔ مسلمان ملکوں میں بھی، مغربی ملکوں میں بھی اور مشرق بعید کے ملکوں میں بھی۔ میری سوچی سمجھی رائے تمہارے ملک کے بارے میں یہ ہے کہ یہاں بے پناہ ٹیلنٹ ہے۔ ترقی کے لامحدود امکانات ہیں لیکن تمہارے قومی جسم کو چند بیماریاں لاحق ہیں اور یہ بیماریاں ٹیلنٹ کو کچھ نہیں کرنے دیتیں۔

پہلی بیماری تم لوگوں کی انتہائی درجہ کی جذباتیت ہے جو تمہیں سوچنے سمجھنے سے تجزیہ کرنے سے اور دعویٰ کا ثبوت دیکھنے سے روکتی ہے۔ اس کی وجہ تعلیم کا نہ ہونا ہے یا

ایک تاریخی روایت کا تسلسل ہے، مجھے نہیں معلوم ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام جذبات کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں۔ میں یہ سن کر حیران ہوتا ہوں کہ تحریک پاکستان میں عوام تمہارے محبوب قائد کی تقریر انگریزی میں سنتے تھے اور بغیر سمجھے لبیک کہتے تھے۔ یہ بات فخر سے بیان کرتے وقت تم لوگوں کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ یہی وہ عوام ہیں جو بغیر سوچے سمجھے ہر بھٹو ہر جمشید دستی ہر پیر سپاہی ہر نجومی اور ہر تعویذ فروش کو کامیاب کراتے ہیں۔ اس جذباتیت کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ تم لوگ کسی ثبوت کسی شہادت کے بغیر اپنی رائے کی درستی پر اصرار کرتے ہو اور مرنے مارنے پر تل جاتے ہو۔ کچھ لوگ آنکھیں بند کر کے طالبان کو الزام دیتے ہیں اور کچھ امریکہ کو اور ثبوت دونوں کے پاس نہیں ہیں اور یہ صرف ایک مثال ہے۔

تم لوگوں کو لاحق دوسری خطرناک بیماری یہ ہے کہ تم قانون کو فیصلہ کرنے نہیں دیتے اور خود فیصلہ کرتے ہو۔ یوں ہر شخص کا فیصلہ مختلف ہوتا ہے۔ جب بھی ٹریفک حادثہ ہوتا ہے اور ایک منٹ سے کم عرصہ میں لوگ وہاں جمع ہو جاتے ہیں تو مدعی اور مدعی علیہ دونوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ چھوڑیں۔ کوئی بات نہیں۔ کوئی ایک شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ آپ کے درمیان پولیس فیصلہ کرے گی۔ آپ اس حد تک قانون سے بھاگتے ہیں کہ اپنے اسلامی قوانین کے مقابلہ میں ذاتی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ آپ کا پسندیدہ رہنما کرپشن کرے تو آپ کی رائے یہ ہوتی ہے کہ سارے کرپشن کرتے ہیں۔ آپ کا پسندیدہ رہنما کسی کو قتل کر دے یا کرا دے تو لاکھوں لوگوں کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ آخر بادشاہ قتل کراتے ہی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ناجائز زمین پر مسجد بنائی جائے تو اسلامی قانون کو پس پشت ڈال کر صرف یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کا گھر ہے۔ جہاں بھی بن جائے۔ اگر اس رویہ کے بجائے تم لوگوں کا رویہ یہ ہو جائے کہ ہر معاملے میں قانون کا فیصلہ دیکھا جائے اور اپنی رائے نہ دی جائے، تو تم لوگوں کی حالت ہی بدل جائے۔

تمہاری تیسری بیماری یہ ہے کہ تم لوگ دوسرے سے رابطہ صرف اس وقت کرتے ہو جب تمہارا اپنا کام ہوتا ہے لیکن جب تمہارے ذمے دوسرے کا کام ہو تو تم رابطہ نہیں کرتے۔ دنیا میں جتنی ترقی یافتہ قومیں ہیں وہ اس بے حد خطرناک بیماری سے پاک صاف ہیں، جس کے ذمے جو کام ہے وہ اسے پورا کر کے متعلقہ شخص کو یا ادارے کو مطلع کرتا ہے اور اگر نہیں کر سکتا تب بھی اطلاع دیتا ہے۔ تمہارے معاشرہ میں ایک غدر برپا ہے، سائل مسئول کے پیچھے، قرض خواہ مقروض کے پیچھے آجر مزدور کے پیچھے بھاگ رہا ہے، جس جگہ پہنچنا ہے وہ وہاں پہنچتا ہے۔ نہ کچھ بتاتا ہے، جس نے کام کر دیا وہ بھی نہیں بتاتا کہ کام ہو چکا ہے۔ جس نے کام نہیں کیا وہ بھی خاموش ہے یا غائب ہے۔ یہ جہالت ہے یا غیر ذمہ داری ہے۔ جو کچھ بھی ہے تمہارے وسائل کو ضائع کر رہی ہے۔

چوتھی خطرناک بیماری یہ ہے کہ تمہاری اکثریت مذہب کو ذاتی اصلاح کے بجائے مالی فائدہ کے لئے استعمال کر رہی ہے اور تم لوگوں کو اس کا احساس تک نہیں۔ اسلام کا اولین مقصد فرد کی اصلاح ہے لیکن اسلام کے جو اصول فرد کی اصلاح کے لئے تیر بہدف ہیں انہیں آج ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ استعمال کر رہے ہیں اور مسلمان انھیں رات دن پیروں تلے روند رہے ہیں۔ صرف ایک مثال دیکھ لو کہ وعدہ خلافی تمہارے معاشرہ میں اس قدر عام ہے کہ شاید ہی کوئی شخص اسے برا سمجھتا ہے۔ جھوٹ کی وہ کثرت ہے کہ گھر، بازار، دفتر، سیاست، تجارت، مسجد ہر جگہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے۔ دوسری انتہا یہ ہے کہ تاجر اپنی اشیاء بیچنے کے لئے لوگوں

کے مذہبی جذبات کا بے تحاشا استحصال کررہے ہیں۔ شہد بیچتے وقت اسے اسلامی شہد کا نام دیا جاتا ہے۔ میں نے کسی ملک میں عیسائی ہندو یا یہودی شہد نہیں دیکھا۔ دوکانوں کا نام مدینہ مکہ اسلامی اور حرمین رکھا جاتا ہے تاکہ جذبات سے کھیلا جائے۔ لالچ اور سنگدلی کی انتہا یہ ہے کہ نہاری اور پان تک تم لوگ اپنے رسول کے نام پر بیچ رہے ہو اور اس توہین پر کسی کو شرم نہیں آتی ہے۔ مذہبی رہنماؤں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ تمہاری آمدنی کے ذرائع کیا ہیں اور مدرسوں میں پڑھانے والے مفلوک الحال علماء اور مدرسوں کے مالکان سے نہیں پوچھتے کہ تمہارا معیار زندگی کروڑ پتیوں جیسا کس طرح ہو گیا ہے؟

تمہاری پانچویں بیماری یہ ہے کہ افریقی ممالک کو چھوڑ کر تم شاید دنیا میں سب سے زیادہ گندے ہو، جتنے گندے تمہارے مسجدوں کے طہارت خانے ہیں اتنے گندے میں نے کسی اور مسلمان ملک میں نہیں دیکھے۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب میں نے دیکھا کہ وضو کرنے کی جگہ ایک مسواک رکھا ہوتا ہے اور ہر شخص آکر اسے استعمال کرتا ہے۔ تم لوگوں کو دھول اور گرد سے گھبراہٹ ہوتی ہے نہ ٹھہرے ہوئے گندے پانی سے گھن آتی ہے، مکان تعمیر کرنے والا تمہاری پوری سڑک پر ریت اور سیمنٹ ڈال دیتا ہے۔ لیکن کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔ تمہارے ٹاپ کے شہروں میں لوگ چلتی گاڑیوں سے پھلوں کے چھلکے اور سگریٹ کی خالی ڈبیاں سڑک پر پھینک دیتے ہیں اور نہ کسی کو شرم آتی اور نہ اعتراض کرتا ہے۔

کاش تم لوگ پوری دنیا کی اصلاح کرنے کے بجائے کچھ وقت ان پانچ بیماریوں کی فکر بھی کرو جنہوں نے تمہارے جسم کو تعفن میں ڈال رکھا ہے''۔ (نوائے وقت۔ ۷رمئی ۲۰۱۲ء)

اہلِ مغرب میں پائی جانے والی بے شمار خرابیوں کے اعتراف کے باوجود مذکورہ مغربی سفارت کار نے مسلمانوں کی جن بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے وہ سو فیصد درست ہیں۔ ہمارے اندر بے انتہا جذباتیت ہے۔ ہم اکثر و بیشتر ہوش کھو کے نرے جوش سے کام لیتے ہیں جس کے نتائج عموماً ہولناک تباہی کی شکل میں نکلتے ہیں۔ ہم میں اکثر دوسروں سے اسی حد تک رابطہ رکھتے ہیں جب تک اس سے اپنا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ ہم میں تعلیم کی بڑی کمی ہے۔ ہماری ملت کی اکثریت صفائی ستھرائی کا اہتمام نہیں کرتی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ مذہب کو ذاتی اصلاح کے بجائے مالی فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا دین ہمیں ان ساری بیماریوں سے پاک کرتا ہے۔ ہمارے دین کی بے شمار معاشرتی اور انسانی و اخلاقی تعلیمات کو اہل یوروپ نے اپنایا ہے۔ یہاں مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے اس ملفوظ کو دہرانا بجا معلوم ہوتا ہے جسے ان کے لائق فرزند شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی نے اپنے دورۂ ہند کے موقع پر ایک خطاب میں کہا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں: ''حق میں دبنے کی صلاحیت نہیں، حق ہمیشہ سربلند رہنے کے لئے آیا ہے **الحق يعلو و لا يعلى عليه** حق تو ہمیشہ سربلند ہوگا اور باطل غالب ہونے کے لئے نہیں بلکہ مغلوب ہونے کے لئے آیا ہے ''**ان الباطل كان زهوقا**''۔ باطل مٹنے اور مغلوب ہونے والی چیز ہے وہ غالب ہونے والی چیز نہیں۔ اگر کسی باطل قوم کو دیکھو کہ دنیا میں ترقی کر رہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے جو اس کو ابھار رہی ہے اور اگر کسی حق قوم کو دیکھو کہ پستی کی طرف جا رہی ہے تو سمجھ لو کہ کوئی باطل چیز اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ باطل قومیں ترقی کرتی ہیں تو باطل کی وجہ سے نہیں بلکہ کوئی حق کی صفت اختیار کرنے کی وجہ سے باطل کو ترقی ملتی ہے۔ عرصہ دراز

سے اہل مغرب کو دنیا میں ترقی مل رہی ہے اس لئے کہ ان کے اندر حق کی کچھ صفات ہیں جس کو انہوں نے اپنی زندگیوں میں اختیار کرلیا ہے''۔

اس کے بعد مولانا تقی عثمانی اہلِ مغرب میں پائی جانے والی حق کی صفات کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بیشتر مغربی ممالک میں یہ معاملہ ہے کہ ان کے یہاں جو مال بک رہا ہوگا وہ لوگ اس کی حقیقت پوری طرح واضح کردیں گے کہ اس کے اندر فلاں چیز اچھی ہے فلاں چیز بری ہے۔ پھر اگر کسی خریدار کی خریدنے کے بعد رائے بدل گئی ایک مہینہ تک بھی اگر واپس سامان لے جا کر دیتا ہے تو بلا تامل اس کو واپس لیا جاتا ہے۔ یہ حکم رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمایا تھا جس کو انہوں نے اپنی تجارت میں اختیار کرلیا۔ اس کے برخلاف ہمارے یہاں بورڈ لگا ہوتا ہے کہ ''خریدا ہوا مال واپس نہیں لیا جائے گا''۔ یہ بات مغرب میں رہنے والا ہر ایک جانتا ہے کہ اگر کسی نے ٹیلی فون ملایا اور اس میں غلط نمبر مل گیا تو اگر وہ شخص ٹیلی فون کمپنی کو فون کر کے کہہ دے کہ مجھ سے غلط نمبر مل گیا تو ٹیلی فون کمپنی مان لیتی ہے اور اس کے بل چارجز ختم کردیئے جاتے تھے جبکہ بعد میں ہمارے لوگ وہاں پہنچے، انہوں نے کالیں کرنی شروع کردیں اور کمپنی کو فون کر کے کہہ دیا کہ یہ رانگ نمبر مل گیا، تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو سہولت میسر تھی وہ بھی ختم ہوگئی''۔ (خطبات دورۂ ہند: ۱۳۰، باختصار)

یہ حقیقت ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی صفات سے عاری ہوتے جارہے ہیں اور غیر ان صفات کو اپنا رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے دنیوی دستور کے مطابق انہیں کامیابی حاصل ہورہی ہے۔ اس حقیقت کو صحابی رسول حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے بھی بڑے اچھے پیرایے میں بیان کیا ہے، ایک مرتبہ حضرات صحابہ آپس میں احادیث کا تذکرہ کررہے تھے حضرت مستورد قریشی نے حضور ﷺ کی ایک حدیث سنائی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تقوم الساعة والروم اكثر الناس''. قیامت کے قریب رومی (عیسائی) لوگ بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے''۔ مجلس میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ وہ اس حدیث کو سن کر چونک گئے اور کہنے لگے ''مستور! ذرا سوچ کر کہو کیا کہہ رہے ہو؟''۔ مستورد نے کہا میں وہی کہہ رہا ہوں جسے میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے۔ اس پر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر فی الواقع یہ حدیث صحیح ہے کہ قیامت کے قریب عیسائیوں کی کثرت ہوگی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں پانچ خصلتیں پائی جاتی ہیں (جو ان کی ساری ترقی کی ضامن ہیں) (۱) وہ فتنہ وفساد کے وقت ہوش سے کام لیتے ہیں جوش میں نہیں آتے۔ (۲) وہ مصیبت اور حادثہ میں مبتلا ہوکر جلد ہی سنبھل جاتے ہیں۔ (۳) انہیں اگر میدان سے بھاگنا پڑے تو جلد تیاری کرکے دوبارہ حملہ آور ہوتے ہیں (مایوس ہوکر نہیں بیٹھتے)۔ (۴) مسکین، یتیم اور کمزوروں کے حق میں وہ بہت اچھے (مددگار) ثابت ہوتے ہیں (۵) اور پانچویں ایک اچھی صفت ان میں یہ ہے کہ وہ بادشاہوں کو مظالم سے روکنے والے ہیں۔ (مسلم شریعت: ۲۹۲/۲)

ضرورت اس بات کی ہے کہ امت مسلمہ اپنے اندر پائی جانے والی ان بیماریوں کو دور کرے جو اس کے جسم کو اندر سے کھوکھلا کررہی ہیں۔ ورنہ وہ اس طرح اقوام عالم کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہوتی رہے گی اور اسے جرم ضعیفی کی سزا ''مرگِ مفاجات'' کی شکل میں بھگتنا پڑے گی۔ اس وقت پورے عالم میں سب سے زیادہ اگر کسی قوم کا لہو ارزاں ہے تو وہ مسلمان ہیں، برما میں کس بے دردی کے ساتھ مسلمانوں کا خون بہایا گیا، ہر شخص جانتا ہے۔ ہمارے ملک میں آسام کا سانحہ ابھی تازہ ہے۔ ان حالات کے باوجود اگر ہم ہوش کے ناخن نہ لیں تو پھر ہماری بے حسی ہمیں تباہ کرکے چھوڑے گی۔

☆☆☆

❑ اصلاحیات

شخصی روابط تربیت کا لازمی حصہ

ابو متین

تعلیم و تربیت میں سے تعلیم مدارس اور کالجز میں دی جاتی ہے اور تربیت کے لئے مختلف پیشوں کے اعتبار سے علیٰحدہ علیٰحدہ ٹریننگ کا نظم ہوتا ہے، اس طرح ان دونوں کا علیٰحدہ علیٰحدہ فیلڈ ہونے کے باجود یہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، باہم مربوط ہیں، تعلیم معلومات حاصل کرنے اور جاننے کا فریضہ انجام دیتی ہے اور تربیت اس تعلیم کو روز مرہ کی زندگی میں برتنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ تعلیم سے بھی آدمی کو رہنمائی حاصل ہوتی ہے لیکن اس تعلیم کو استحکام تربیت کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ تربیت میں عملاً کر دکھانا ہوتا ہے۔

پیشہ ورانہ تربیت صرف متعلقہ شعبے کی تکنیکی ضرورت کو پورا کرتی ہے لیکن دین اسلام کی تربیت انسانی زندگی کی مکمل رہنمائی پر مبنی ہوتی ہے۔ اس تربیت کی اہمیت ایک دوسری ہی نوعیت کی ہوتی ہے اور یہ تربیت دوسری تمام تربیتوں پر حاوی ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے کتابیں نازل فرمائی ہیں، لیکن اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ان مقدس کتابوں پر عمل درآمد کر کے اسوۂ حسنہ چھوڑنے کے لیے رسولوں کو بھی مبعوث فرمایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کا علم دیا گیا اور وقتاً فوقتاً ہدایات بھی دی گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عملاً تربیت فرمائی، اس طرح تعلیم و تربیت کا عمل پورا ہوا اور دین اسلام کے ماخذ قرآن و سنت اور صحابہ کے نمونوں کی حیثیت سے محفوظ و مامون ہوگئے۔ اصل ماخذ قرآن و سنت ہیں اور ضمنی حیثیت میں صحابہ کو بھی لیا جاتا ہے۔

اگر صرف قرآن مجید کو رہنمائی کے لیے کافی سمجھا جائے اور حضور اکرم کے نمونوں اور احادیث سے صرف نظر کیا جائے، جیسا کہ کچھ من موجی حضرات کا خیال ہے تو تربیت کے لفظ کو ڈکشنری سے نکال دینا ہوگا کیونکہ اصول و ضوابط اور ہدایات اس وقت تک کارآمد نہیں ہوسکتے ہیں جب تک کہ ان پر عمل کر کے نہ بتایا جائے کہ یہ واقعی قابل عمل ہیں۔ مشرکین مکہ کے اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو فرشتوں میں سے منتخب نہ کرتے ہوئے انسانوں میں سے اٹھانے کی یہ وجہ بتائی ہے کہ انسانوں کی رہنمائی کسی (مخصوص) بشر کے ذریعہ ہی مناسب ہوسکتی ہے، اگر فرشتوں کی رہنمائی کرنی ہوتی تو فرشتوں میں سے کسی فرشتے ہی کو مقرر کیا جاتا۔ انسانوں کا رہبر کوئی انسان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تربیت کے لیے یگانگت اور ہم نسل ہونے کی وجہ سے موزونیت رہے گی، اگر کسی فرشتے سے یہ کام لیا جاتا تو لوگوں کا یہ بجا اعتراض سامنے آتا کہ ہم انسان فرشتے کو کس طرح رول ماڈل بنا سکتے

ہیں؟ جب کہ ہمیں بے شمار حاجتیں لگی ہوئی ہیں، کھانے پینے رہنے سہنے اور بیوی بچوں کی پرورش وغیرہ کی دشواریاں فرشتے کو لاحق نہیں ہوتیں۔ ہم سے اس رہبر کا کیا مقابلہ؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانی مشکلات اور پریشانیوں میں مبتلا ہو کر ان سے نمٹنے کی جدوجہد کرنا، انسانوں کو حوصلہ بخشتا ہے۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ قیامت تک کے سارے انسانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ اسلام سچا، واحد اور فطری طریقہ زندگی ہے۔ موجودہ مادیت زدہ دنیا میں یہ دین حنیف اور زیادہ پرکشش اور سائنٹفک اصولوں پر مبنی ثابت ہوتا ہے جبکہ اس کی حقیقی حیثیت کو لوگوں کو سامنے لایا جائے۔ غلو اور افراط وتفریط پسند لوگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مافوق البشر بنانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں، یہ قرآن مجید کے فہم سے نابلد ہونے کی علامت ہے۔ اللہ محفوظ رکھے۔

تعلیم کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی مقصود ہوتی تو کتابوں پر ہی اکتفا کیا جاتا۔ ہدایات نازل کرنے کے علاوہ ان ہدایتوں پر عمل درآمد کرتے ہوئے پیغمبروں کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا، اس لیے ان کو مبعوث کرتے ہوئے تربیت کا تقاضا پورا کیا گیا اور پھر ان پیغمبروں نے اپنی عملی جدوجہد کے ذریعہ ساتھیوں کی ایک جماعت بھی تیار کی تا کہ اس مشن کو مزید ایک مدت تک جاری رکھا جاسکے۔ تربیت کی اس نوعیت کو سمجھنے کے لئے اللہ تبارک تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی ۱۵۱ ویں آیت میں جامع نشاندہی فرمائی ہے، ملاحظہ ہو ''ہم نے تمہارے درمیان خود تم میں سے ایک رسولؐ بھیجا ہے، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہاری زندگیوں کو سنوارتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہ جانتے تھے۔'' تعلیم کے ساتھ زندگیوں کو سنوارنے سے مراد تربیت دینا ہی ہے، انسانوں کے درمیان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کی حیثیت سے مبعوث کرنا اسی مقصد کو پورا کرتا ہے، باری تعالیٰ کی آیات سناتے ہوئے تعلیم دینا اور زندگیوں کو سنوارنے کی جدوجہد کرنا دراصل تزکیہ نفس ہے۔ نفس انسانی کو پاک وصاف کر کے انسانیت کے اعلیٰ معیار پر پہنچانا ہی تربیت ہے۔

یوں تو تربیت کے مختلف انداز ہوسکتے ہیں لیکن وہی انداز کامیاب اور فائدہ مند ہوگا جس کو اللہ کے نیک بندوں نے اختیار کیا تھا بلکہ پیغمبروں نے اپنی زندگی میں ایک خاص گروہ کو تربیت دے کر اس کے نقوش چھوڑے ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف مراحل میں حق وراستی کو اختیار کرتے ہوئے راستہ بتایا ہے، ان کو معلوم کر کے بھی رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے لیکن ہر فرد کے منفرد واقعات پر ان کا انطباق کرنا آسان نہیں ہوتا، اس کے علاوہ نفس کی رکاوٹیں بھی مانع ہوتی ہیں، ان سب وجوہات کا حل یہی ہے کہ تربیت کے لیے ایک ایسی شخصیت موجود ہو جو مستقل ساتھ رہتے ہوئے نگرانی کرے۔ یوں تو تربیت کچھ عرصہ کی صحبت سے بھی دی جاسکتی ہے، جیسے حکومت عصری علوم کی تعلیم کے لئے دوسال کی ٹریننگ رکھتی ہے، اس عرصہ میں طریقۂ تعلیم کے علاوہ تعلیمی ماحول میں رہ کر سماجی فرائض انجام دینے کے قابل بناتی ہے اور پھر جب یہ معلم اپنے معمول کی ڈیوٹی انجام دیتا ہے تو وقفہ وقفہ سے معائنہ اور نگرانی کے ذریعہ فرائض کو انجام دینے میں مدد دیتی رہتی ہے، اسی طرح تعلیمی نظام بحسن وخوبی انجام پاتا ہے، تربیت کا یہ انداز صحیح خطوط پر جاری رہتا اور ڈسپلین میں جھول پیدا نہ ہونے کا بندوبست ہوتا تو سرکاری مدارس سے بہتر کہیں اور تعلیم کا نظام نہ ہوتا، کیوں کہ تربیت کا یہ طریقہ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد وجود میں آیا ہے، تساہلی کا شکار ہونا الگ مسئلہ ہے۔

اسلام کا تربیتی نظام بہت زیادہ مؤثر اور کارگر ہے، پانچوں نمازوں میں مسجد میں حاضری دینے والے مسلمانوں کی

خداپرستی کے کیا کہنے؟ ہر چیز مسبب الاسباب سے مانگنے کا تصور اور بندگانِ خدا کے ساتھ روابط کی بنیاد خداترسی اور تقویٰ پر قائم رہتی ہے۔ محلّہ کی مسجد کا امام اور علاقہ کی جامع مسجد کے قاضی افراد کی ہر قسم کی رہنمائی کے لئے ہمہ وقت حاضر رہتے ہیں۔ اسی طرح نیکوں کی صحبت سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں کو بہت کم غفلت طاری ہونے کا امکان رہتا ہے، اس کے علاوہ اسلام نے جماعت یا تنظیم سے وابستہ رہ کر زندگی بسر کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے اور جماعت کے صدر اور امیر کی اطاعت کے تحت رہنے کو لازم گردانا ہے، یہ وہ صحبت ہوتی ہے کہ جس سے امیر و مامورین کے تعلقات کا نظم مستحکم ہوتا ہے، ڈسپلین کی یہ دنیا بے مثال ہوتی ہے، یہ تعلق حاکم ومحکوم کا ہرگز نہیں ہوتا بلکہ ساتھی اور مددگار کی حیثیت سے سہولت بخش ہوتا ہے۔

تربیت جس امر کا تقاضہ کرتی ہے وہ ایک ایک فرد کو اجتماعیت میں ضم کر کے باہمی اخوت ومحبت کی فضا بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے، چونکہ آدمی کے لئے بہ یک وقت خیر اور شر دونوں سمتوں کی راہیں کھلی ہیں اور مزاج میں بھی یہ دونوں صفات موجود ہوتی ہیں اس لئے وہ جن حالات اور جن لوگوں کے درمیان رہتا سہتا ہے بہت جلد ان کے اثرات قبول کر کے زندگی کی ٹرین اسی دستیاب پٹری پر چلانے لگتا ہے۔

یہ تقاضائے فطرت ہے، عموماً وعظ وتقریر اور مطالعہ کے علاوہ نسلی میلانات بھی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آدمی کو متاثر کرنے میں ان کا بھی اہم رول ہوتا ہے، لوگ اچھے مقرر کو سننے کے متلاشی ہوتے ہیں، کتابوں کے مطالعہ سے بھی فکری دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور نسلی رجحانات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں لیکن ان سب پر حاوی تربیت کا نظام ہوتا ہے کیونکہ تربیت فرد کو مستقلاً مصروف رکھتی ہے۔ تنظیم سے وابستہ ہونے پر اجتماعیت کے ذمہ دار کی صحبت دستیاب ہوتی ہے جو جماعتی دائرہ ان افراد کو گھیرے رکھتا ہے، اس کا مرکزی نقطہ بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے وہ امیر یا صدر تنظیم کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اگر یہ فعال اور اپنے فرض منصبی کو پورا کرنے کا عزم کر کے اقدام کرے تو بہت کچھ کر سکتا ہے تنظیمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ، کارکنوں سے تعلقات استوار کر کے ان کے نجی اور ذاتی حالات سے واقف ہونے کا بیڑہ اٹھائے تو تربیت کے ایک بہتر انداز کی شروعات ہوگی، صحبت کی تاثیر اور شخصی روابط کا جادو کارکنوں کو نئی زندگی بخشتا ہے، ساتھیوں کے اندرونی حالات سے واقفیت کے بعد ان کو کام پر لگانے کی باری آتی ہے، صلاحیتوں کے مطابق مصروف رکھنے کی ذمہ داری پوری کرنا ضروری ہے، یہ تبھی ممکن ہے جب جماعت کے ذمہ دار سے اس کے کارکنوں کے شخصی روابط اس معیار کے ہوں۔ ورنہ سرسری جان پہچان سے امیر و مامور کی حیثیت بھی واضح نہیں ہوتی۔ ذمہ داری کے بوجھ کو محسوس کر کے کچھ کر گزرنے کا تہیہ کرے تو صلاحیتوں میں جلا پیدا ہوتی ہے اور راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ سرکاری دفاتر اور مدارس اور دواخانوں وغیرہ میں اونچے معیار تعلیم کے حامل قابل اور اعلیٰ صلاحیتوں کے نوجوانوں کو منتخب کر کے بھرتی کیا جاتا ہے لیکن مناسب نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے کارکردگی صفر ہوا کرتی ہے۔ تنظیم وتربیت کا روایتی نظام اسی وقت ثمر آور ہوسکتا ہے جب کہ اس کے سربراہ اپنے ساتھی کارکنوں کے ساتھ گہرے شخصی روابط قائم کر کے تربیت کا حق ادا کریں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سینکڑوں صحابہ کے ساتھ جس قسم کا ربط ضبط رکھ کر ان کی تربیت کی تھی وہ ہمارے سامنے ہے، ضرورت ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

وما علینا الا البلاغ

☆☆☆

❑ اصلاحیات

آزادی کے نام پر بے ادبی کا بڑھتا رجحان

زین العابدین ندوی
دارالعلوم امام ربانیؒ، نیرل

انسانوں کو اس کے خالق نے حدود وقیود کے ساتھ مکمل آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کیا ہے ، اور پھر انسانوں کے سمندر میں موجود مسلمانوں کی شکل میں جو لعل وجواہر ہیں ان کو بھی آزادی سے محروم نہیں کیا، بلکہ آلودگیوں اور گندگیوں سے حفاظت کی خاطر اسے مخصوص قسم کی آزادی عطا کرتے ہوئے بے لگام ہونے سے بچانے کی ہر ممکن تدبیر کی، جو آزادی کے بالکل منافی نہیں۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ یہ رداء حفاظت غیروں کی آنکھوں کا کانٹا ہے، جسے وہ اتار پھینکنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہر صاحب بصارت چلتی راہوں کرتا رہتا ہے، اور اس منحوس وناپاک عمل کو آزادی کا پرفریب نام دے کر سامان زیب وزینت بنایا جا رہا ہے، جو دراصل بے ادبی کا درس اولیں ہے۔ اس کے دام فریب کے اسیروں میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے، لیکن خدا ترسوں کی ایک جماعت ہر علاقہ اور ہر زمانہ میں ایسی رہی ہے جس نے ان نعروں کو بے اثر بنانے میں اپنی زندگی داؤ پر لگا دی، اور خدائی نصرت بھی ان کا ساتھ دیتی رہی ، یہ وہ خدا پرست اور دین دوست لوگوں کی جماعت ہے، جنہیں لوگ دقیانوس کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے وہ نیک بندے اللہ کی مرضیات کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اور خود کو خدا کا تابع وفرمانبردار بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حق پسندوں کو اولاً کسی بھی زمانہ میں اچھا نہیں سمجھا گیا ، گرچہ بعد میں ان کی حقانیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

آزادی کے اس پرفریب نعرے کے شکار جہاں عام انسان بکثرت ہو رہے ہیں، اور ان کا وجود باعث ننگ ثابت ہو رہا ہے ، انسانوں کی جماعت انسان ہونے کے باوجود جانوروں کی صفوں میں شامل ہوتی جا رہی ہے، وہیں دوسری جانب وہ قوم جو دین وشریعت اور صراط مستقیم کی حامل ہے وہ بھی مستانہ واران کی نقالی کو سامان فخر وافتخار سمجھتی جا رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کا سایہ بھی ان پر نہیں پڑا ، خود کو اسلام کی طرف منسوب کرنے والی امت آج خدا کی عطا کردہ آزادی کو ناکافی سمجھنے لگی، اور دین دشمن تحریکوں کی طرف سے جاری کردہ آزادی کی دیوانی اور

متوالی نظر آرہی ہے، یہ کیا ہے؟ اور کیوں ایسا ہورہا ہے؟ یہ بہت بڑا سوال ہے جس کا حل تلاش کرنا نہ صرف یہ کہ ضروری ہے، بلکہ اس کو پیش کرنا وقت کا تقاضا ہے۔

اس معمہ کی گرہ کشائی کی ذمہ داری کن کندھوں پر ہے؟ یہ کون ہیں جو حل تلاش کریں گے اور پھر قوم کو اس پر گامزن کریں گے؟ اس مرحلہ پر پہونچ کر دم گھٹنے لگتا ہے اور بے چینی چھا جاتی ہے، کہ جو حل پیش کرنے والے تھے وہ خود اس دام فریب کے اسیر ہورہے ہیں، اور ان کے دل ودماغ بھی اس سے متأثر ہوتے جا رہے ہیں، مرعوبیت اور احساس کمتری کے شکار ہوتے دکھ رہے ہیں، ہاں میں آپ سے دوٹوک کہتا ہوں کہ اس گندی فضاء کو پاکیزگی بخشنے کا کام اگر کوئی کرسکتا تھا یا کرسکتا ہے تو وہ ایسے ادارے اور اراکین ادارہ ہیں، جو دین کا صرف فہم نہیں بلکہ صحیح فہم اور تعلیمات اسلامی پر مکمل دسترس رکھتے ہیں، جن کی نگاہوں میں بلندی، سخن میں دلنوازی ہو، جن کے دل ودماغ سوائے اسلامی تعلیمات اور خدائی قانون کے کسی سے مرعوب اور متأثر نہ ہوں، جو اسلامی تہذیب کے نہ صرف یہ کہ عاشق ہوں؛ بلکہ اس کے علمبردار اور داعی بھی ہوں، جو حالات کے تقاضوں سے واقف ہوتے ہوئے اس کا اسلامی حل پیش کریں، نہ کہ اس سے مرعوب ہوکر ان کی تہذیب کے غلام ہوجائیں۔

اب آپ بتائیں امت کی کشتی کے یہی کھیون ہار اگر مرعوب ہونے لگیں، شریعت کے مقرر کردہ دائرہ آزادی کو بھول کر دام مغرب کے اسیر ہونے لگیں، تو پھر امید کن سے کی جائے؟ اور کیا امید وابستہ کی جائے؟ یاد رہے کہ مدارس اسلامیہ خواہ ان کی حالت کچھ بھی ہو، وہ ان اہم سہاروں میں سے ایک ہیں، جن سے ایمان کی حفاظت کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے، ان مدارس کی خوبی بلند وبالا، فلک بوس عمارتوں میں نہیں، کاغذات سے لدے پھندے دفاتر میں نہیں، قوانین کی کثرت میں نہیں ہے، قطعا نہیں ہے، بلکہ ان کی خوبی یہ ہے کہ ان سے متعلق فرد متأثر ومرعوب نہ ہونے پائے، دنیا کی نیرنگیاں اور پھیلی ہوئی بوقلمونیاں اس کی نگاہوں کو خیرہ نہ کرنے پائیں، اور یہ اشیاء اس کے ایمانی تقویت کا سامان ثابت ہوں، لیکن یاد رہے اگر اس خوبی کا معیار بدل گیا یا بدل دیا گیا، تو پھر ان چراغوں سے روشنی کی امید تو دور ان کا تحفظ بھی مشکل ہے۔

انتہائی افسوس اور تکلیف کے ساتھ مابعد کی سطریں لکھنے کی جرأت کررہا ہوں، کہ آزادی کے نام پر بے ادبی کا جال اب مدارس پر بھی پھینکا جارہا ہے، اور طلباء علوم اسلامیہ بھی اپنے اصل اوصاف سے دور ہوتے جارہے ہیں، یہ انتہائی تکلیف دہ صورت حال ہے جس کا بروقت تدارک کرنا اور اس خوفناک مہلک مرض سے مدارس کی حفاظت کرنا آپ تمام کی ذمہ داری ہے، ورنہ اس جرم میں برابر کے شریک سمجھے جائیں گے، کیونکہ جانتے بوجھتے غلط چیز کو نہ روکنا غلط کرنے جیسا ہے، باقی فیصلہ آپ کے ہاتھ میں۔

☆☆☆

❑ فقہیات

خواتین کا حق وراثت اور سماجی رویے

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی
استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام، عمرآباد

دور جاہلیت میں انسانیت کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت نہ تھی ، اور نہ ہی انسان کا کوئی حق مسلم تھا، بلکہ معمولی معمولی باتوں پر جنگ چھڑ جاتی تھی، زمانہ دراز تک خون کی ندیاں بہتی تھیں، انسان کا خون بہت ہی سستا اور ارزاں تھا، طبقات کی تقسیم، قبائلی عصبیت اور حسب ونسب کے غرور نے بعض انسانوں کو بعض انسانوں سے ممتاز بنادیا تھا، آباء واجداد کے نام پر فخر کے ساتھ قصیدے سنائے جاتے تھے، دشمنوں پر ہجو کرنا شاعروں کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا، حق تلفی عام ہوگئی تھی، کمزوروں اور ضعیفوں کے حقوق سلب کئے جاتے تھے، خصوصاً عورتوں کو بالکل ہی حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا، اور اسے توجہ کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا، وراثت میں انہی لوگوں کو حق دیا جاتا تھا جو جنگ کے میدان میں اپنی قوت وطاقت کے جوہر دکھاسکیں، اور شہ سواری میں اپنا کمال دکھاسکھیں، اپنی قوت کے ذریعہ مقابل کو گراسکیں، بعض قبائل کا حال یہ تھا کہ بچی کی ولادت کو نحوست گردانتے تھے، لڑکی کی ولادت کے بعد چہرہ چھپا کر شرم اور عار کی وجہ سے محفلوں اور بازاروں سے دور بھاگتے اور کنارہ کشی اختیار کرلیتے تھے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔

(سورہ نحل ۵۸-۵۹)

ترجمہ۔ جب اُن میں سے کسی کو بیٹی (کی پیدائش) کی خبر دی جاتی ہے تو اُس کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے، اور دی ہوئی خبر سے عار کی وجہ سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اور سوچتا ہے کہ آیا اس لڑکی کو ذلت کے باوجود زندہ ہی رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے؟ دیکھو یہ لوگ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں۔

نیز مکہ کے مشرکین اپنے خود ساختہ نظام کی پیروی کرتے تھے، جس کے مطابق میراث میں مردوں کا حصہ تو ہوتا تھا مگر عورتیں اور بچے اس سے کلی طور پر محروم رکھے جاتے، حد تو یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد عورت خود میراث کا حصہ بن کر سوتیلے بیٹوں کے حصے میں آجاتی تھی، جہاں عورت کو سامان زندگی کی حیثیت دے دی گئی ہو وہاں اس کو وارث بنانے کا سوال کیسے پیدا ہوسکتا تھا؟

دوسری انتہاء یہ ہے کہ دور جدید میں اہل مغرب نے مساوات کا نعرہ بلند کیا، مرد اور عورت کے لئے یکساں حقوق دینے کا پرزور مطالبہ کیا، اور اسلام کے نظام عدل کو ظلم

سے تعبیر کیا، ہر میدان میں عورت کو مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کرا سے کھلونا بنادیا، عورت کو مردوں کے جذبات وخواہشات کی تسکین کا ذریعہ قرار دیا، خاندانی نظام کو پامال کیا، مقدس رشتوں کی دھجیاں اڑائیں، یہاں تک کہ ماں اور بیٹے کے مقدس رشتہ کو مجروح کیا، انھیں نکاح کے بندھن میں دیکھ کر غیرت بھی نہ جاگی، بلکہ اسے ذاتی حق سمجھ کر تماشائیوں کی صف میں کھڑے رہنے کو تہذیب وثقافت کا نام دیا۔ایسی تہذیب پر ہزار بار لعنت ہو۔

قبل از اسلام میراث کی تقسیم کی بنیاد نسب اور سبب پر منحصر تھی ،نسب کا مطلب یہ تھا ،جو لوگ میت کے قرابت داروں میں سے قریبی رشتہ دار جن میں دشمنوں اور حریفوں سے جنگ وجدال کی صلاحیت ہوتی وہی لوگ میراث یعنی میت کے متروکہ ،منقولہ اور غیر منقولہ جائداد پر قبضہ کر لیتے ،جیسے بیٹا وغیرہ ، اگر بیٹا نہ ہوتا تو عصبات میں جو قریبی اولیاء ہوتے انہیں مال موروث مل جاتا جیسے بھائی اور چچا وغیرہ ،عورتوں ، یتیموں اور بوڑھوں،ضعیفوں کا وراثت میں کوئی حق نہ ہوتا ، خصوصی طور پر یتیم لڑکیوں پر بڑا ظلم ہوتا تھا جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے سورہ نساء کی آیت نمبر دو(وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُم (ترجمہ: اور یتیموں کو ان کے مال دے دو) کی تفسیر میں مروی ہے کہ صاحب حیثیت اور صاحب جمال یتیم لڑکی کسی ولی کے زیر پرورش ہوتی تو وہ اس کے مال اور حسن و جمال کی وجہ سے اس سے شادی کر لیتا لیکن اس کو دوسری عورتوں کی طرح پورا حق مہر نہ دیتا۔اللہ تعالی نے اس ظلم سے روکا، اگر تم گھر کی یتیم بچیوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے تو تم ان سے نکاح ہی مت کرو،تمہارے لئے دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کا راستہ کھلا ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، بحوالہ احسن البیان،ص۲۰۲)

مذکورہ افراط وتفریط کے بعد اگر ہم انصاف کے ساتھ دین اسلام کے احکام وآداب کا مطالعہ کریں گے تو عزت و سکون اور راحت صرف اور صرف اسلام کی آغوش میں ہی پائیں گے، اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا، عورت کو ہر روپ کے ساتھ اس کا مخصوص حق دیا، اس کی عزت وناموس کی حفاظت کے تعلیمات سے نوازا، یہاں تک کہ ماں کے مقام کو اس قدر بلند کیا کہ دنیا اس کے مرتبہ کو دیکھ کر ششدر رہ گئی ،ارشاد نبوی ﷺ ہے: **الجنة تحت اقدام الامهات**، جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

(مسند الشہاب للقضاعی,۱۱۹)

نیز مرد کو حاکم اور نگران بنایا، کمانے اور کھلانے پلانے کی کوئی ذمہ داری عورت کے نازک کندھوں پر نہیں رکھی، ہر لحاظ سے مرد کو عورت کا کفیل قرار دے کر عورتوں پر عظیم احسان کیا، ارشاد باری تعالی ہے: **اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِم** . (النساء:۳۴)

ترجمہ : مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں۔

آیت کریمہ میں مرد کی قوامیت و حاکمیت کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ایک وہبی صلاحیت ہے جو مردانہ قوت وصلاحیت ہے جس میں مرد عورت سے خلقی طور پر ممتاز ہے۔ دوسری وجہ کسبی ہے، جس کا مکلّف شریعت نے مرد کو بنایا ہے اور عورت کو اس کی فطری کمزوری اور مخصوص تعلیمات کی وجہ سے جنہیں اسلام نے عورت کی عفت وحیا اور اس کے تقدس کے تحفظ کے لئے ضروری قرار دیا ہے، عورت کو معاشی جھمیلوں سے دور رکھا ہے۔ (احسن البیان،ص۲۲۰)

علم میراث کی تعریف : فقہ وحساب کے وہ اصول جاننا جن کے ذریعہ ترکہ میں ہر وارث کا حصہ معلوم کیا جائے۔

اہمیت: علم فرائض کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے واضح ہے کہ اصحاب فرائض کے حصوں کا معاملہ یا ترکہ کی تقسیم کو اللہ تعالی نے کسی نبی یا رسول یا فرشتہ کے حوالہ نہیں کیا ، بلکہ وراثت اور وارثوں کی تفصیلات بذات خود قرآن کریم کی تین آیتوں میں بڑی تفصیل سے بیان فرمائیں، نیز اس کو فریضة من الله (یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہیں) وصية من الله (اللہ کی طرف سے تاکیدی حکم ہیں) اور تلک حدود الله (یہ اللہ کی حدیں ہیں) فرما کر اس علم میراث کو حقداروں کے لئے واضح فرمادیا۔

میراث ہی ایک ایسا معاملہ ہے جس کی تقسیم کو اللہ تعالی نے اپنے اختیار میں رکھا ہے، کسی انسان کے حوالہ نہیں فرمایا، شرعی طور پر وہ وارثین جن کے حصے پہلے سے تقسیم شدہ ہیں، جنہیں اصحاب الفرائض کہا جاتا ہے وہ بارہ ہیں ، ان میں بھی آٹھ عورتیں ہیں جن کا مخصوص حصہ شریعت نے متعین کردیا۔

اصحاب فرائض : ۱۔شوہر ۲۔ باپ ۳۔دادا ۴۔ماں شریک بھائی (Maternal Brother) ۵۔بیوی ۶۔ماں ۷۔دادی/نانی ۸۔بیٹی ۹۔پوتی ۱۰۔سگی بہن ۱۱۔باپ شریک بہن (Paternal Sister) ۱۲۔ماں شریک بہن (Maternal Sister)

میراث کے احکام - سورہ نساء کی تین آیتوں میں تفصیلات میراث وارد ہیں۔

پہلی آیت اصول میت (میت کے والدین ،دادا، پردادا، نانی، دادی۔) اور فروع میت (میت کی اولاد یعنی بیٹے بیٹیاں، پوتے ، پوتیاں وغیرہ) کے ترکہ سے متعلق ہے، ارشاد باری ہے۔ يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ. (سورۃ النساء،۱۱)

ترجمہ ۔اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں (تاکیدی) حکم کرتا ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

اس آیت میں اولاد کا تذکرہ ہے، اولاد میں تین طرح کی تفصیلات ہیں، کبھی صرف لڑکے، صرف لڑکیاں اور کبھی لڑکے اور لڑکیاں ملے جلے ۔صرف لڑکے ہوں تو وہ عصبہ بن جاتے ہیں، بہنوں کے ساتھ ہوں تو بھی انہیں عصبہ بنالیتے ہیں، یعنی لڑکوں کو دوگنا اور لڑکیوں کو ایک حصہ، اگر صرف لڑکیاں ہوں تو ایک ہونے کی صورت میں آدھا حصہ، دو اور دو سے زیادہ ہوں تو دو تہائی ترکہ کی وارث ہوں گی۔ نیز اسی آیت میں والدین کی وراثت کی تفصیلات وارد ہیں۔

دوسری آیت: وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَد" (النساء،۱۲)

ترجمہ: تمہاری بیویاں جو کچھ چھوڑ مریں اور ان کی اولاد نہ ہو تو آدھوں آدھ تمہارا ہے

اس آیت میں میاں بیوی اور اخیافی بھائی بہنوں (ماں شریک بھائی اور بہنوں) کی وراثت سے متعلق احکامات ہیں۔

تیسری آیت: يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَة (النساء،۱۷۶)

ترجمہ: وہ لوگ آپ سے فتوی پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالی خود تمہیں کلالہ (وہ میت جس کا باپ موجود ہو اور نہ ہی کوئی بیٹا) کے بارے میں فتوی دیتا ہے۔

اس آیت میں سگے بھائی، بہنوں کی وراثت کی تفصیلات مذکور ہیں، یعنی صرف بھائی لوگ ہوں تو برابری کے ساتھ عصبہ ہوں گے، اگر صرف بہنیں ہوں تو ایک کے لئے نصف، دو یا دو

سے زیادہ ہوں تو دو تہائی حصے، اور اگر بھائی بہن مشترک ہوں تو بھائی کا حصہ بہن کے مقابلہ میں دوگنا ہوگا۔

دور جاہلیت نے حق وراثت کے لئے معیار کے طور پر قوت، طاقت اور شہ سواری کو تسلیم کیا تو اسلام نے کم زوروں اور ضعیفوں کی مکمل رعایت کی، مردوں، عورتوں، ضعیفوں، بیواؤں اور یتیموں کے حق ملکیت اور حق وراثت کو تسلیم کیا، ارشاد فرمایا، وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا. (سورۃ النساء، ۳۲،۳۳)

ترجمہ۔ اور جس چیز میں اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اُس کی ہوس مت کرو۔ مردوں کو اُن کاموں کا ثواب ہے جو اُنہوں نے کئے اور عورتوں کو اُن کاموں کا ثواب ہے جو اُنہوں نے کئے اور اللہ سے اُس کا فضل (وکرم) مانگتے رہو۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ اور جو مال ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ مریں تو (حقداروں میں تقسیم کردو کہ) ہم نے ہر ایک کے حقدار مقرر کردیئے ہیں اور جن لوگوں سے تم عہد کر چکے ہو اُن کو بھی اُن کا حصہ دو۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کے سامنے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے علم میراث کی شرعی حیثیت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، الحقوا الفرائض باهلها فما بقى فهو لاولى رجل ذكر (بخارى، ۶۷۳۲، مسلم ۱۶۱۵) یعنی وراثت کے مقررہ حصے ان کے حقداروں کو دے دو، پھر جو مال بچ جائے میت کے سب سے زیادہ قریبی مرد کے لئے ہے۔ ایک اور روایت میں نبی کریم ﷺ نے مورثین (وارث بنانے والوں) کو یہ ہدایت بھی دی کہ اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ جائیں یہ بہتر ہے کہ وہ تمہارے بعد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔ (بخاری ومسلم)

میراث کے قانون پر عمل کرنے والوں کے لئے خوشخبری، اور عمل نہ کرنے والوں کے لئے دوزخ کی وعید۔

ارشاد ربانی ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ.

ترجمہ۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ایسے باغات میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے اور اللہ کی حدود سے آگے نکل جائے، اللہ اسے دوزخ میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اسے رسوا کرنے والا عذاب ہوگا۔

احکام میراث کی تفصیلات کے بعد مذکورہ آیتوں میں وعدوں اور وعیدوں کا تذکرہ ہے، یعنی جو شخص اس قانون وراثت کو توڑے گا، عورتوں کو وراثت سے محروم رکھے گا، یا صرف بڑے بیٹے کو مستحق وراثت قرار دے یا عورت مرد کو برابر کا حصہ دار قرار دے یا جائداد کو سرے سے تقسیم ہی نہ کرے، اور اسے مشترکہ خاندانی جائداد قرار دے دے تو ایسے سب لوگ حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے اور اسی عذاب الیم کے مستحق ہیں۔

(تفصیلات کے لئے: تیسیر القرآن: سورہ نساء: آیت نمبر ۱۳-۱۴)

مذکورہ نصوص شرعیہ کی روشنی میں مندرجہ ذیل احکام ثابت ہوتے ہیں:

۱- عربوں کا خود ساختہ نظام میراث باطل ہے، سراسر ظلم پر مبنی ہے، حقدار کو حق دینے کے بعد بچا ہوا مال عصبہ کو ملے گا، رسول اکرم ﷺ نے عملاً نظام میراث کو جاری کیا جیسا کہ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ سعد بن ربیعؓ کی بیوی اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی: یہ سعدؓ کی بیٹیاں ہیں، ان کا باپ جنگ احد میں شہید ہوگیا ہے۔ بچیوں کے چچا نے سعد کے سارے مال پر قبضہ کرلیا ہے اوران کے لئے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور مال کے بغیر ان کا نکاح بھی نہیں ہوسکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی خود اس معاملہ میں فیصلہ فرمائے گا۔ پھر آیت میراث نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سعد کے بھائی کو بلایا اور فرمایا کہ ترکہ میں سے دو تہائی تو سعد کی بچیوں کو اور آٹھواں حصہ ان کی والدہ کو۔ باقی جو بچے (یعنی ۲۴ حصوں میں سے صرف ۵ حصے) وہ تمہارا ہے۔

(ترمذی، ابواب الفرائض)

۲- مال موروث خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، جائداد منقولہ ہو یا غیر منقولہ بہر حال وہ وارثوں میں تقسیم ہوکر رہے گا۔

۳- قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ دار محروم ہوں گے، جیسے بیٹے کی موجودگی میں بھائی یا پوتا وغیرہ محروم ہوں گے، یا بیٹے یا دو بیٹیوں کی موجودگی میں پوتی محروم ہوتی ہے۔

۴- نبی کریم ﷺ نے نزول قرآن کے وقت سماج کے دیگر مسائل کی طرح مسئلہ میراث کو بھی شاندار انداز میں سلیقے سے سلجھادیا، عورتوں کے علاوہ چھوٹے بچوں، یتیموں، بیواؤں کو بھی وراثت میں حق دیا، ارشاد فرمایا کہ اللہ نے مرنے والے کے رشتہ داروں میں سے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اس لئے کسی وراث کے حق میں وصیت کرنا جائز نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد: ۲۸۷)

۵- قبل از اسلام میراث کا یہ دستور نہ تھا، بلکہ عورت خود ورثہ شمار ہوتی تھی، اللہ نے اسے مقام ذلت سے نکال کر اصحاب فرائض میں شمار کیا۔

۶- اسلام نے حقوق کی پاس داری کی، ہر شخص کو اس کا صحیح حق دیا، ہر حقدار کو اس کے مناسب حق سے متعارف کرایا، دونوں کو ہی وراث بنایا، انتہائی انصاف کے ساتھ ماں باپ یا دیگر رشتے داروں کے متروکہ مال میں حصے مقرر فرمائے۔

۷- نظامِ میراث عدل وانصاف پر مبنی ہے اور عین فطرت کے مطابق ہے، بلکہ حقدار کو حق پہنچانا دین اسلام کا شعار خاص ہے، خواہ متروکہ جائداد کم ہو یا زیادہ۔

۸- بیوی خواہ ایک ہو یا چار ان کا حصہ (۱) ربع یعنی چوتھائی ہے، جب کہ میت (شوہر) کی کوئی فرع وارث نہ ہو۔ (۲) ثمن یعنی آٹھواں حصہ جب میت (شوہر) کی کوئی وارث موجود ہو۔

۹- خلع کی عدت یا طلاق رجعی کی عدت کے دوران اگر شوہر وفات پاجائے تو بھی مطلقہ بیوی کی حیثیت سے ضرور وارث ہوگی جیسے بیوی عدت خلع یا طلاق کی عدت کے دوران انتقال کرجائے تو شوہر وارث ہوگا، یعنی جب تک زوجیت باقی رہتی ہے میاں بیوی ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں۔

۱۰- وراثت میں اگر مرد کو عورت کے حصہ سے دوگنا حصہ دیا گیا ہے تو اس کے ساتھ نان ونفقہ کی ذمہ داری بھی اس پر رکھی گئی ہے جب کہ کمانے یا نان ونفقہ کی کوئی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے، ایک مرد کا حصہ اگر لڑکی کے بالمقابل دوگنا حصہ ہے تو کئی صورتیں ایسی ہیں جن میں عورت کا حصہ مرد کے حصوں سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے مثال کے طور پر بیٹی کی تین حالتیں ہیں:

۱) آدھا حصہ: جب وہ اکیلی ہو بشرطیکہ میت کا کوئی بیٹا نہ ہو۔
۲) دوتہائی حصے: جب وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں بشرطیکہ کوئی بیٹا بھی نہ ہو۔
۳) عصبہ بغیرہ: جب اس کے ساتھ میت کا کوئی بیٹا موجود ہو۔

نیز میت کی پوتی بھی نصف مال کی وارث ہوتی ہے جب کہ وہ اکیلی ہو بشرطیکہ میت کا بیٹا، بیٹی یا پوتا (اس کا سگا بھائی یا چچازاد بھائی) نہ ہو۔ نیز وہ دوتہائی مال کی وارث ہوتی ہے جب کہ وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں بشرطیکہ بیٹا، بیٹی یا پوتا نہ ہو۔ نیز میت کی بہن، باپ شریک بہن بھی بعض خاص حالات میں آدھے اور بعض صورتوں میں دوتہائی حصوں کی وارث ہوتی ہیں، جب کہ شرعاً مرد کا حصہ دوتہائی تک نہیں پہنچتا الا ماشاءاللہ۔

۱۱- نصف حصہ پانے والے اصحاب الفرائض پانچ لوگ ہیں، مثلاً شوہر، بیٹی، پوتی، سگی اور باپ شریک بہن۔ یعنی پانچ وارثین میں سے چار خواتین ہیں جو اصول اور قوانین میراث کے تحت کل ترکہ کا آدھا حصہ پاتی ہیں، پھر بھی ان خواتین پر روٹی، کپڑا اور مکان کی ذمہ داری عورت پر واجب نہیں ہے، صرف مرد کا ذمہ ہے خواہ عورت اپنی جگہ صاحب حیثیت ہو، جاگیردار ہو، بینک بیلنس والی ہو۔

۱۲- اسلامی قانون کے تحت مردوں کے حصوں کی بہ نسبت خواتین کو بعض خاص حالات میں زیادہ حصے دئے گئے ہیں، کل ترکہ کا دوتہائی حصہ پانی والی خواتین چار ہیں، جب کہ ان چار اصحاب الفرائض (بیٹیاں، پوتیاں، سگی بہنیں اور باپ شریک بہنیں) میں سے کوئی بھی مرد وارث نہیں ہے جس کا حصہ (دوتہائی) ثلثان متعین ہو، یعنی خواتین ورثاء کا حصہ شرعا زیادہ ہے خواہ وہ نصف حصہ پانے والیاں ہوں یا دوتہائی حصہ پانے والیاں، پھر بھی جب اس کا شوہر وفات پا جائے تو اس کی کفالت مرد پر ہی واجب ہے، مثلا باپ، بیٹا، بھائی، چچا وغیرہ عصبات پر کفالت کی ذمہ داری ہے۔

۱۳- **عصبہ بالغیر چار خواتین:** یعنی ہر وہ عورت جو اصحاب فرائض میں سے ہو اور اپنے بھائی کی وجہ سے عصبہ بنے، **عصبہ** سے مراد میت کے وہ قریبی رشتہ دار جو وارث بنتے ہیں لیکن ان کا حصہ متعین نہیں ہے۔ **للذکر مثل حظ الانثیین** کے مطابق مردوں کو دوگنا حصہ اور عورتوں کو اکہرا حصہ ملتا ہے، اور یہ بھی کل چار خواتین ہیں: مثلاً ۱- بیٹی، ۲- پوتی، پڑپوتی، ۳- سگی بہن، ۴- باپ شریک بہن۔

۱۴- **عصبہ مع الغیر** - ہر وہ عورت جو کسی دوسری عورت کے ساتھ مل کر عصبہ بنے اور وہ دو ہیں:
(۱) سگی بہن جب بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو۔ (۲) باپ شریک بہن جب بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو۔

۱۴- میراث میں عورتوں کے حقوق بنتے ہیں، ان تک حق نہ پہنچانا اللہ کے حرام کردہ امور کا ارتکاب لازم آتا ہے، وعید کے مستحق بن جانے کا خوف ہمیشہ مستحضر ہونا ضروری ہے۔

۱۵- میراث میں حقوق خواتین کی تفصیلات۔

۱- وراثت میں ماں کے حصے:

۱- چھٹا حصہ: میت کی اولاد یا ایک سے زائد بھائی بہن کی موجودگی میں کل جائداد کا چھٹا حصہ ملے گا۔

۲- ایک تہائی حصہ: میت کی اولاد یا ایک سے زائد بھائی بہن کی غیر موجودگی میں کل جائداد کا ایک تہائی حصہ ملے گا۔

۳- ثلث مابقی: والدین کے ساتھ زوجین میں سے کوئی وارث بن رہا ہو تو ایسی صورت میں شوہر یا بیوی کا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ مال کا تہائی حصہ ملے گا۔

۲- بیوی کے حصے :

چوتھائی حصہ: جب میت کی اولاد نہ ہو۔ آٹھواں حصہ جب میت کی اولاد زندہ ہو۔

نوٹ: بیوی ایک ہو یا ایک سے زیادہ ہوں تو بھی اسی آٹھویں یا چوتھائی حصے میں شریک ہوں گی۔

۳-دادی یا نانی کا حصہ: جب میت کی ماں یا اس سے قریبی دادی/ نانی نہ ہوتو چھٹا حصہ ملے گا۔

جب میت کی ماں یا اس سے قریبی دادی/ نانی موجود ہوتو وہ محروم ہوں گی۔

نوٹ: دادی اور نانی اکھٹے ہونے کی صورت میں چھٹے حصے میں ہی شریک ہوں گی۔

۴-بیٹی کے حصے:

۱-نصف حصہ: میت کی نرینہ اولاد نہ ہو اور صرف ایک ہی بیٹی وارث ہو۔

۲-دوتہائی حصے: جب میت کی دو یا دو سے زائد بیٹیاں ہوں۔

۳-عصبہ بغیرہ: میت کا بیٹا موجود ہوتو میت کی بیٹی اپنے بھائی کے ساتھ ملکر باقی مال میں سے جتنا مال بھائی کو ملے گا اس کا آدھا حصہ لے گی۔

۵-پوتی کے حصے:

۱-آدھا حصہ-یعنی جب وہ اکیلی ہو بشرطیکہ میت کا بیٹا بیٹی یا پوتا موجود نہ ہوں۔

۲-دوتہائی حصے جب وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں بشرطیکہ بیٹا، بیٹی یا پوتا نہ ہوں۔

۳-چھٹا حصہ جب پوتیوں کے ساتھ ایک بیٹی ہو بشرطیکہ بیٹا یا پوتا نہ ہو۔

۴-عصبہ بغیرہ جب پوتیوں کے ساتھ پوتا ہو یا وقت ضرورت پڑپوتا وغیرہ موجود ہو۔

۵-محروم-جب میت کا بیٹا ہو یا اسی طرح میت کی دو یا دو سے زائد بیٹیاں ہوں، بشرطیکہ پوتا، یا پڑپوتا وغیرہ نہ ہو۔

۶-سگی بہن کے حصے:

۱-آدھا حصہ-یعنی جب وہ اکیلی ہو بشرطیکہ میت کا باپ یا دادا یا میت کی اولاد (بیٹا، بیٹی) یا پوتا موجود نہ ہوتو متروکہ مال کا آدھا حصہ ملے گا۔

۲-دوتہائی حصے-جب وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں بشرطیکہ میت کا بھائی، بیٹا، بیٹی یا باپ، دادا نہ ہوں۔

۳-عصبہ بغیرہ-جب اس کے ساتھ سگا بھائی ہوتو جتنا ایک بھائی کو حصہ ملے گا اس کا آدھا حصہ بہن کو ملے گا بشرطیکہ میت کا بیٹا اور باپ موجود نہ ہوں۔

۴-عصبہ مع غیرہ-جب وہ میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو بشرطیکہ میت کا بیٹا اور باپ نہ ہوں تو ایسی صورت میں بیٹی یا پوتی کے حصہ پانے کے بعد باقی مال کے وہ وارث ہوگی۔

۵-محروم-جب میت کا بیٹا یا پوتا یا باپ زندہ ہوں (**القریبی تحجب البعدی** یعنی میت کا قریبی رشتہ دور کے رشتہ دار کو محروم کردے گا)۔

۷-باپ شریک بہن کے حصے:

۱-آدھا حصہ-یعنی جب وہ اکیلی ہو بشرطیکہ میت کا باپ شریک بھائی، یا میت کی اولاد (بیٹا، بیٹی) یا سگے بھائی بہن موجود نہ ہوں۔

۲-دوتہائی حصے-جب وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں بشرطیکہ میت کا باپ شریک بھائی، بیٹا، بیٹی یا باپ، دادا یا سگے بھائی نہ ہوں۔

۳-چھٹا حصہ-جب اس کے ساتھ ایک سگی بہن ہو بشرطیہ میت کا باپ شریک بھائی، بیٹا، بیٹی یا باپ، دادا یا سگے بھائی نہ ہوں۔

۴-عصبہ بغیرہ-جب اس کے ساتھ باپ شریک بھائی ہوتو جتنا ایک بھائی کو حصہ ملے گا اس کا آدھا حصہ بہن کو

ملے گا بشرطیکہ میت کا بیٹا اور باپ موجود نہ ہوں یا سگے بھائی / بہن عصبہ بغیرہ نہ بنے ہوں اور نہ ہی سگی بہنیں عصبہ مع غیرہ بنی ہوں۔

۵-عصبہ مع غیرہ جب وہ میت کی بیٹی یا پوتی کے ساتھ ہو بشرطیکہ سگے بھائی / بہن عصبہ بغیرہ نہ بنے ہوں اور نہ ہی سگی بہن عصبہ مع غیرہ بنی ہوں۔

۶-محروم-جب میت کا بیٹا یا پوتا یا باپ زندہ ہو یا سگے بھائی / بہن عصبہ بغیرہ بنے ہوں یا سگی بہن عصبہ مع غیرہ بنی ہوں۔

۸-ماں شریک بھائی/ بہن کے حصے:

۱-چھٹا حصہ-جب وہ ایک ہو بشرطیکہ میت کی کوئی فرع وارث (اولاد) یا باپ دادا نہ ہوں۔

۲-تہائی حصہ-جب وہ دو یا دو سے زیادہ ہوں خواہ صرف بھائی/صرف بہنیں ہوں یا ملے جلے ہوں بشرطیکہ میت کی کوئی فرع وارث (اولاد) یا باپ دادا نہ ہوں، سب تہائی حصہ میں شریک ہو جائیں گے۔

۳-محروم-جب میت کی کوئی فرع وارث یا باپ دادا زندہ ہوں۔

الغرض اسلام نے عورت پر احسان کا معاملہ کیا، ہر طرح کی ذلت سے بچایا، اصحاب الفرائض میں آٹھ عورتوں کو شامل فرما کر مختلف روپ سے عورت کے حقوق کی پاسداری کی، ایک ہی عورت ممکن ہے بار بار آٹھ حیثیتوں سے وارث بن سکتی ہے، کبھی بیٹی، کبھی بہن، کبھی ماں، کبھی باپ شریک یا ماں شریک بہن، کبھی دادی، نانی اور کبھی بیوی کی صورت میں تو کبھی عصبہ بالغیر تو کبھی عصبہ مع الغیر کی مذکورہ صورتوں میں وراثت میں حق پاتی ہے، بہت ساری عورتیں ایسی بھی ہیں جن پر کفالت وغیرہ کی ذمہ داری نہ ہونے کے سبب مال جمع کر کے کار خیر/ وقف/ وصیت وغیرہ کر کے خدمت خلق/ رفاہ عامہ کے کاموں میں اپنی پونجی لگاتی ہیں اور مستفید ہوتی ہیں جب کہ مرد مسائل اور حقوق کی کثرت کے سبب ایسا بہت کم کر پاتے ہیں۔

عورت کا حق وراثت اور موجودہ سماجی رویے:

مسلم سماج کا بڑا المیہ یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں جو علم ''علم میراث'' کے نام سے باقاعدہ ایک فن کے طور پر جانا جاتا ہے، اس فن کو اجتماعی طور پر نظر انداز کیا گیا، الا ما شاء اللہ۔ اکثر عوام الناس کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ انہیں وراثت سے متعلق اپنے مسائل کو اسلام کے مطابق حل کرنا ہے، اور اس سلسلے میں اسلام کی کچھ تعلیمات وارد ہیں، اس بے علمی کی وجہ سے میراث کی شرعی تقسیم نہیں ہو پاتی۔ عموماً عورت کے حصہ میں محرومی ہی آتی ہے، پرائے گھر جانے کے بعد وہ کلی طور پر اپنے گھر والوں، خصوصا بھائیوں کے لئے پرائی بن جاتی ہے، شریعت کا یہ قانون پس پشت ڈالا جاتا ہے، حق ضائع ہوتا رہتا ہے، نسلیں وراثت سے محروم ہی رہتی ہیں، ظلم کا سلسلہ طویل ہو جاتا ہے، حق وانصاف کی صبح نمودار نہیں ہوتی، حالانکہ ناحق کسی کے مال پر قبضہ کرنے والوں کے لئے یہ وعید بھی آئی ہے کہ جس نے ظلم کرتے ہوئے کسی کی ایک بالشت زمین بھی ہڑپ کر لی تو قیامت کے دن ساتوں زمینوں میں سے اتنے حصے کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ (مسلم: ۱۶۱۰) کسی مسلمان کا مال ہڑپ کرنے والا شخص جب اللہ تعالی سے ملاقات کرے گا تو اللہ اس سے ناراض ہوگا۔

(مسند احمد، ۳۹۴۶)

موجودہ معاشرے میں ایسی مسلم خواتین بھی ہیں جو اپنے حقوق کے لئے قانونی جنگ لڑتی ہیں، سالوں سال تک عدالتوں کے چکر کاٹ رہی ہیں، مذہب نے تو ان کا حق دیا ہے

مگر معاشرہ ان کا یہ حق چھینتا ہے، کہیں خواتین اپنوں کے ہاتھوں تشدد کا نشانہ بنی ہوئی ہیں، غیروں سے انصاف کی بھیک مانگ رہی ہیں۔

۱- موجودہ دور ہزار ترقی یافتہ ہونے کے باوجود سماج میں آج بھی مسلمان عورت مظلوم ومقہور ہے، اسے سماج میں شرعی حق نہیں ملا جو ملنا چاہئے تھا، تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی اسے حق وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے، اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اکثر وبیشتر مقامات میں مسلمانوں کی مخلوط آبادیاں (یعنی مسلم اور غیر مسلم افراد پر مشتمل ہے) زمانہ سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے رہتے آپس میں بہت ساری عادتوں اور رسم ورواج کو قبول کر چکی ہیں، اس حقیقت سے فرار ناممکن ہے، مثلا ہندوانہ رسم ورواج میں عورت کے لئے حق وراثت کا تصور نہیں ہے، اس لئے اس سماج میں شادی بیاہ کے موقع پر دولہا جہیز اور جوڑے کی رقم کے طور پر جتنا لوٹنا ہے لوٹ لیتا ہے، اس لئے کہ شادی کے بعد یا باپ کی موت کے بعد حق وراثت نام کی کوئی چیز ملنے والی نہیں ہے، اس رسم کو مسلم سماج نے قبول کیا، شادی کے وقت ہی جوڑے کی یا جہیز کے نام پر وافر مقدار میں مال و دولت، سونا چاندی وغیرہ مانگ کر لیا جاتا ہے، جب باپ کی وفات ہوتی ہے تو مرحوم کی اولاد صاف کہہ دیتی ہے کہ والد صاحب نے شادی میں اسے بہت کچھ دیا ہے، اسے وراثت میں کچھ نہیں دیا جائے گا، حالانکہ جہیز کا رواج ہندوانہ رسم ورواج ہے، شرعی طور پر اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، باپ مجبور ہوکر دیتا ہے، اس سبب سے عورت کو وراثت سے محروم کرنا شرعا جائز تو نہیں ہے۔

۲- بعض خاندانوں کا ماحول ایسا ہے، مثلا باپ کی وفات کے بعد بھائی اپنی بہنوں کا حق میراث فورا دینے کی بجائے لاعلمی کی وجہ سے تاخیر کرتے ہیں، ٹال مٹول کرتے ہیں، یہاں تک کہ زمانہ کی رفتار تیز ہوجاتی ہے اور منقولہ یا غیر منقولہ جائداد کی قیمت دوگنی یا اس سے کہیں زیادہ ہوجاتی ہے، بھائیوں کی نیتوں میں فرق آجاتا ہے، پھر رشتوں میں فرق آنے کے ساتھ قطع رحمی کی شکلیں پیدا ہوجاتی ہیں، یعنی شروع میں نیت کچھ اور تھی، بعد میں کچھ اور ہی ہوجاتا ہے، اس دوران عورت سماج میں مظلوم بن کر رہ جاتی ہے، حق تلفی کی وجہ سے رشتوں میں ایسی دراڑیں پڑجاتی ہیں کہ اس شگاف کو بند کرنا مشکل ہوجاتا ہے، حقدار کو حق نہ دینے سے بکھرے موتیوں کی طرح رشتوں کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

۳- مسلمانوں کی دین سے دوری اور لاعلمی کی حد یہ ہے کہ جب بیٹی کی وفات ہوتی ہے تو سسر یہ سمجھتا ہے کہ بیٹی کی وفات کے ساتھ داماد کا رشتہ اور حق وراثت بھی ختم ہے، اس لئے بیٹی کے ترکہ کے وارثین میں اپنے داماد کا تذکرہ بھی نہیں کرتا، حالانکہ شوہر کا حق وراثت (چوتھائی/آدھا حصہ) مسلم ہے۔

۴- عام طور پر چھ وارثین ایسے ہیں جن کا حق کبھی بالکلیہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ حصوں میں کمی بیشی ممکن ہے۔ جیسے ماں، باپ، شوہر، بیوی، بیٹا اور بیٹی۔ ان کا خصوصی طور پر استفتاء میں ذکر ہونا چاہیے، نیز مفتی حضرات کو بھی ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی فتوی جاری کرنا چاہئے، استفسار نہ کرنے کی صورت میں حقدار محروم ہوجاتے ہیں۔

۵- بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ کی وفات کے بعد مرحوم کے بیٹے ترکہ پر قابض ہوجاتے ہیں اور بہنوں کو حق نہیں دیتے، دیتے بھی ہیں تو کچھ حصے برائے نام، جائداد سے پوری طرح مستفید ہوتے رہتے ہیں، خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ، یہاں تک کہ تاخیر کی صورت میں مناسخہ کا مسئلہ

درپیش ہوتا ہے ، یعنی وارثین میں سے کئی وارثین وفات پاجاتے ہیں ، جب کہ مورث اول کا ترکہ تقسیم نہیں ہو پاتا، تاخیر کی وجہ سے رنجشیں اور کدورتیں جنم لیتی ہیں، بسا اوقات سگے بھائیوں میں خون ریزی کی نوبت آجاتی ہے،اور خاندان تباہ ہوجاتا ہے۔

۶- ملک کے طول وعرض میں سال بھر مختلف موضوعات پر سمینار اور کانفرنس منعقد ہوتے رہتے ہیں، خطبات جمعہ کے سلسلے بھی جاری ہیں مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس موضوع پر مسلم سماج میں بیداری مہم چلانے ،مظلوم وارثین (مرد اور عورتوں) کا حق وراثت دلانے کی کوشش کی جاتی ہو، جب کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ علم میراث سیکھ لو ،اور لوگوں کو بھی سکھاؤ، اس لئے کہ یہ آدھا علم ہے، اور یہ علم سب سے پہلے بھلایا جائے گا، اور میری امت سے اٹھالیا جائے گا۔

(سنن ابن ماجہ:۲۸۱۹)

متفق علیہ تجاویز:

اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے تیئیسویں فقہی سمینار (جمبوسر، گجرات) بتاریخ: ۲۸، ۲۹، ربیع الثانی ویکم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ مطابق ۱-۳/ مارچ ۲۰۱۴ء میں میراث ووصیت سے متعلق چند تجاویز منظور ہوئیں، افادہ کی غرض سے موضوع سے متعلق چند تجاویز قارئین کے لئے پیش خدمت ہیں:

۱- قانون میراث شریعت کا ایک اہم ترین حصہ ہے اور مسلمانوں کے لئے اسی کے مطابق ترکہ کی تقسیم شرعی فریضہ ہے، لہٰذا اگر کسی ملک میں مسلمانوں کے لئے احکام شریعت کے مطابق نظام میراث نافذ نہ ہو تو وہاں مسلمانوں کو چاہئے کہ حکومت سے نظام میراث کے نفاذ کا مطالبہ کیا جائے، اس کے لئے پُرامن جدوجہد کی جائے اور جب تک ایسا نظام قانونی طور پر نافذ نہ ہو، رضا کارانہ طور پر اسے نافذ کرنے کی سعی کی جائے۔

۲- جن ممالک میں اسلام کا قانون میراث جاری نہیں ہے، اور وصیت کے بغیر ورثہ کو ان کا شرعی حق نہ مل سکے، وہاں اس طرح کا وصیت نامہ لکھنا واجب ہوگا، جو مورث کی موت کے بعد قانون شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کا ذریعہ بن سکے، البتہ مورث وصیت نامہ کو نافذ کرانے کے لئے اپنی زندگی میں کسی کو وکیل (وصی) بنادے تاکہ مورث کی وصیت کے بعد اگر ورثہ میں اضافہ یا کمی ہوجائے تو حکم شریعت کے مطابق حذف واضافہ کا حق اسے حاصل رہے۔

۳- ورثہ کے حصص شرعیہ کا وصیت نامہ لکھنا حدیث: "لا وصیة لوارث" (وارث کے لئے وصیت کا اعتبار نہیں) کے خلاف نہ ہوگا، کیونکہ اس حدیث کا مصداق وہ وصیت ہے جس میں کسی وارث کو ضرر پہنچانا مقصود ہو۔

۴- وارث کے حق میں حق شرعی سے زائد کی وصیت کرنا معتبر نہیں، البتہ اگر دوسرے ورثہ راضی ہوں تو اس کا اعتبار ہوگا اور ورثہ کی یہ رضامندی مورث کی موت کے بعد ہی معتبر مانی جائے گی۔

۵- کوئی مسلمان کسی کافر کا اور کوئی کافر کسی مسلمان کا شرعاً وارث نہیں ہوسکتا۔

۶- ایسے غیر مسلم ممالک جہاں مسلمان سے غیر مسلم قرابت دار کو اور غیر مسلم سے مسلمان قرابت دار کو ملکی قانون کے مطابق موت کے بعد چھوڑے ہوئے مال میں حصہ دلایا جاتا ہو، وہاں مسلمان کے لئے اس حیثیت سے اس کا لینا جائز ہوگا کہ اسے حکومت کی طرف سے یہ مال حاصل ہورہا ہے۔

۷- ترکہ کی تقسیم میں اختلاف سے بچنے کے لئے اگر مورث اپنی زندگی میں ہی اپنے ترکہ کی حصۂ شرعی کے مطابق

تقسیم کے لئے تحریر لکھ دے تو جائز ہے، البتہ اگر وارث کی موت سے پہلے ورثہ کی تعداد میں اضافہ یا کمی ہوجائے تو اس نئی صورت حال کے مطابق ہی ترکہ کی تقسیم ہوگی۔

۸- شوہر کے لاولد ہونے کی صورت میں اگر بیوی کے علاوہ کوئی شرعی وارث نہ ہو تو بیوی دو طرح سے ترکہ کی حقدار ہوگی۔ ایک اپنے حصۂ شرعی کے اعتبار سے، دوسرے علم میراث کی اصطلاح کے مطابق "من یردّ علیھم" میں داخل ہونے کی وجہ سے۔ لیکن اگر شوہر اپنی بیوہ کا حق محفوظ رکھنے کے لئے کوئی تحریر بھی لکھ دے تو کوئی حرج نہیں۔

(نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص ۱۹۰-۱۹۱)

نیز اسلامک فقہ اکیڈمی، انڈیا کے تیرہویں فقہی سمینار (کٹولی، لکھنؤ) بتاریخ: ۱۸، ۲۱، محرم ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۳-۱۶/ اپریل ۲۰۰۱ء میں خواتین کی میراث سے متعلق چند تجاویز/قرارداد منظور ہوئیں جو درج ذیل ہیں:

۱- ملک بھر سے آئے ہوئے علماء اور فقہاء اور اصحاب افتاء کا یہ اجتماع اس بات پر اپنی گہری تشویش کا اظہار کرتا ہے کہ صوبہ اتر پردیش میں ابھی تک خواتین کے ساتھ وراثت کے معاملہ میں بے انصافی اور ظلم جاری ہے۔ یوپی کے موجودہ قانون کے مطابق خواتین کو زراعتی اراضی میں مرد وارثان کی موجودگی میں وراثت کے حق سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ قانون ہندوستان کے آئین اور شریعت اسلامیہ سے متصادم ہے۔

۲-اس سمینار کے شرکاء اس بات پر بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلم پرسنل لا (شریعت) اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء کی دفعہ ۲ سے زراعتی اراضی کو نکال دیا گیا ہے جس کی بنیاد پر مسلمان خواتین اپنے شرعی حق وراثت سے قانونی طور پر محروم ہوگئی ہیں۔

۳-یہ بات درست ہے کہ علماء کرام نے اس سلسلہ میں کئی فتاوی جاری کئے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ تر مسلم خاندانوں میں وراثت کی تقسیم قرآن وسنت کی روشنی میں کی جاتی رہی ہے، اس سب کے باوجود بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یوپی زمینداری ایکٹ اور شریعت ایکٹ میں فوراً ترمیم کی ضرورت ہے تاکہ خواتین کو عام طور سے اور مسلم خواتین کو خاص طور سے ان کے حق وراثت سے محروم نہ کیا جاسکے۔ (نئے مسائل اور فقہ اکیڈمی کے فیصلے: ص ۱۱۱)

خلاصۂ موضوع:

الغرض ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم خواتین کے ساتھ انصاف کیا جائے اور انہیں حق وراثت سے محروم نہ رکھا جائے، خواہ ترکہ کی مقدار کم ہو یا زیادہ، ہر حال میں وراثت کی تقسیم میں تاخیر نہ ہو، کسی کا حق وراثت نہ دینا یا ٹال مٹول کرنا، کچھ حصہ دینا اور کچھ نہ دینا، بھی بہت بڑا ظلم ہے، وراثت کی شرعی تقسیم سے مسلم معاشرہ میں امن وسکون اور رشتوں کا تقدس اور ان کے مابین محبت قائم رہے گی، بلکہ آیات مواریث کے آخر میں حقوق کی ادائیگی پر ہمیشگی کی جنتوں کا وعدہ ہے، ورنہ سماج میں فساد برپا ہوگا، اس سے بڑھ کر احکام میراث پر عمل نہ کرنے کی صورت میں دوزخ کی وعیدیں وارد ہیں، معاذ اللہ۔ اللہ تعالی مسلم معاشرے کو احکام شریعت پر عمل کرنے اور خصوصاً خواتین کو حق وراثت دینے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

وصلى الله على نبينا محمد وبارك وسلم، والحمد لله رب العالمين.

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

توجہ سے سننا:

علی کے والد تھکے تھکائے اپنے کام سے گھر واپس آئے، گھر میں داخل ہوتے ہی انھوں نے ٹی وی کا شور سنا، اگر چہ انھیں دیکھ کر کسی بچے نے آواز کچھ کم کر دی مگر پھر بھی ان کی پریشانی باقی رہی، انھوں نے کہا ''اگر تم لوگوں نے فوراً آواز کم نہیں کی تو میں اس کو توڑ کر پھینک دوں گا''۔

جذبات وا حساسات میں تمیز کیجئے:

یہ جو حادثہ پیش آیا اگر یہ بار بار ہو تو اہل خانہ کی زندگی پر اس کے مضر اثرات پڑنے کا امکان بڑھ جاتا ہے، اس کا سبب دوسروں کے جذبات کا احترام نہ کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جیسے ہمارے جذبات ہیں ویسے ہی دوسروں کے جذبات ہیں، یہ تو بہت آسان ہے کہ بچے اگر ہم کو پریشان کریں اور غصہ دلائیں تو ہم ان کو ملامت کرنے لگیں لیکن کیا یہ انصاف کی بات ہے؟ ظاہر ہے کہ ہمارے احساسات ہمارے اندروں سے جنم لیتے ہیں، ہمارے ذہن میں جو افکار و اعتقادات ہوتے ہیں ان پر ہمارے احساسات مبنی ہوتے ہیں، مثلاً اگر ہمارا یہ ماننا ہے کہ جو ہم کہیں وہی حرف بحرف کرنا بچوں پر لازم ہے، اب اس صورت میں اگر بچے ایک انچ بھی آگے پیچھے کریں گے تو ہم بہت پریشان ہوں گے، اس کے برخلاف اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بچوں کو خود بھی فیصلے کا اختیار ہے، تو ان کے فیصلے لینے سے ہم فخر بھی محسوس کریں گے اور سکون بھی اس لیے اہم بات یہ ہے کہ چیزوں کو ہم کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، معاملات کو کس طرح سمجھتے ہیں، ہمیں اپنے زاویۂ نگاہ کو تبدیل کر کے اپنے احساسات میں تبدیلی لانی ہوگی۔

کبھی کبھی ہم کو بچوں پر شدید غصہ آتا ہے، یہ ایک فطری بات ہے، غصہ کا آنا اس وقت تک بُرا نہیں ہوتا جب تک وہ عملی شکل میں نہ ظاہر ہو جائے، بڑے اگر ذرا سختی اور شدت سے اپنے احساسات کا اظہار کریں تو اس سے بچے بہت مرعوب ہو جاتے ہیں، اس لیے اس طرز سے بچوں سے نہیں پیش آنا چاہیے بلکہ ان سے گفتگو کے دوسرے طریقے تلاش کرنا چاہیے، مثلاً ان سے دوستانہ انداز میں بات کی جائے، ان کو لے کر پارک کی طرف نکل جایا جائے، یا ان کو لے کر کسی جسمانی عمل میں لگ جائیں جیسے کچن کی صفائی وغیرہ۔

اگر بچے کسی مشکل کا سبب بن جائیں تو عام طور پر بڑوں کو بہت برا لگتا ہے اور وہ اس کو ناکامی اور بہت بڑا گناہ سمجھنے لگتے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ ایسے موقع پر ان کو اپنے آپ کو کوسنا چاہیے کیونکہ بچہ تو موروثی خصوصیات کا حامل ہے، ہر بچے کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں اور ہر بچے کی زندگی میں اس کا اپنا ایک رول ہوتا ہے، تاکہ اس کو وہ ادا

کرے، ظاہر ہے کہ بچے میں یہ پریشانیاں اہل خانہ نے نہیں پیدا کیں، اس لیے انھیں بچوں کو گناہ کا احساس نہیں دلانا چاہیے، نہ ہی بچے کی ان مشکلات سے نمٹتے ہوئے ان پر مسلط ہونا چاہیے۔

بچوں کی بات نہ سننے کے اثرات:

اوپر جو گفتگو ہوئی اس کا تعلق اہل خانہ کے جذبات واحساسات سے ہے، یہ بات بھی آچکی کہ بچوں کے بھی اپنے جذبات ہوتے ہیں، جب احساسات و جذبات اس درجہ اہم ہیں تو سوال یہ ہے کہ بڑے بچوں کے دل اور دماغ میں کیا چل رہا ہے اس کو کیسے جانیں اور سمجھیں؟ اور بچوں کو کیسے باور کرائیں کہ وہ یہ احساسات و جذبات سمجھ رہے ہیں؟ کیونکہ اگر بچوں کو اس کا ادراک ہو جائے کہ بڑے جذبات سمجھ رہے ہیں، تو اس سے از خود ان کے نامناسب برتاؤ میں خوشگوار تبدیلی آتی ہے۔ ذیل میں ہم اس کی کوشش کرتے ہیں کہ بڑے بچوں کے جذبات کے ساتھ کس طرح کا تعامل کریں اور ان کو کیسے برتیں۔

آج کل عام طور پر بہت سے والدین، نوجوان بچوں (Teen ager) کے بارے میں یہ شکوہ کرتے ہیں کہ وہ والدین اور اہل خانہ سے اچھی طرح گفتگو نہیں کرتے، یہاں غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ یہ والدین خود ان بچوں کی بات پر کس حد تک توجہ دیتے ہیں اور کس قدر سنتے ہیں؟ جب بچے اپنے ساتھ پیش آئی کسی مشکل کا ان سے تذکرہ کرتے ہیں تو وہ کیا جواب دیتے ہیں؟ یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ کہیں بچے بات کرنے سے ڈرتے تو نہیں؟ کہ ابھی وہی لکچر شروع ہو جائے گا اور وہی تنبیہات اور اصولوں کی فہرست جاری کی جائے گی، ان پہلوؤں پر غور کر کے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ والدین خود ہی کس طرح اپنے بچوں کو یہ سکھانے کا موقع گنوا دیتے ہیں کہ بچے ان کے جذبات کے ساتھ کس طرح کا تعامل کریں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑوں کی نصیحت ہمیشہ اچھی نیت اور خیر خواہی کے جذبہ سے ہوتی ہے مگر اکثر و بیشتر وہ مفید و مؤثر نہیں ہوتی، فی الحقیقت وہ بچوں کو مسلسل نصیحتوں، پوچھ تاچھ، تحقیق اور ڈانٹ ڈپٹ بلکہ کبھی کبھی ان کا مذاق بنا کر انھیں خود سے دور کر دیتے ہیں۔

توجہ طلب بات یہ ہے کہ کبھی کبھی تو شفقت بھی ان کی بات نہ سننے کا سبب بن جاتی ہے، جب بچہ کسی چیز سے متاثر، پریشان اور غمگین آتا ہے، تو اس کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالے جو کچھ دل میں ہے وہ کہہ ڈالے لیکن بعض والدین فوراً یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں ''روؤ مت''، ''غم نہ کرو، غصہ نہ کرو''، ''کل آج سے بہتر ہوگا''، ''فکر مت کرو میں دوسرا خرید لاؤں گا''، ظاہر ہے کہ یہ تمام جملے بڑوں کی نیک نیتی کا نتیجہ ہیں، مگر بچے کو اس صورت حال میں جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے وہ اسے اس کا موقع نہیں دیتے، اس موقع پر ان کو یہ ادراک کرانا ضروری ہے کہ کوئی ہے جو ان کی بات سنتا ہے اور ان کے جذبات کی قدر کرتا ہے۔

جب بچے پریشان ہوتے ہیں تو وہ اپنے جذبات اور اپنی پریشانی بیان کرنا چاہتے ہیں، بسا اوقات وہ اپنے احساسات کا اظہار، رونے، چیخ و پکار مچانے، یا قہقہے لگانے سے کرتے ہیں، ایسے موقع پر اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو روکا جائے تاکہ وہ دوسروں کی ایذا رسانی کا سبب نہ بنیں، ایسے موقع پر والدین کو پورے طور پر بچوں کو اپنے جذبات کا اظہار کرنے دینا چاہیے، بجائے اس کے کہ وہ انھیں اپنے احساسات بیان کرنے سے روکیں، اور کوشش کریں کہ وہ اپنے احساسات چھپالیں، ان سے یوں کہیں کہ دیکھو ''اچھے بچے روتے نہیں''۔

اس حال میں بچوں کو والدین کی مکمل توجہ کی

ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ان کو محبت سے چمٹانا چاہیے، کم ز کم ان پر دست شفقت پھیرنا چاہیے، تا کہ بچہ اپنی بے اطمینانی اور پریشاں خاطری کو بیان کر کے اس سے چھٹکارا پائے اور آگے بڑھ جائے، اگر اہل خانہ یہ بات سمجھ جائیں اور بچوں کی بات سننے پر اچھی طرح توجہ دینے لگیں، تو اس سے نہ صرف بچے کو والدین کی محبت، احترام اور قدر دانی کا احساس ہوگا بلکہ ایک اچھے انسان کی طرح وہ نشو نما پائے گا اور اس کے آگے بڑھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

متحرک اور اچھے انداز میں انسان کیسے سنے:

بچے کی بات پر توجہ دینا اور اچھی طرح سے سننا ظاہر ہے کہ سرسری عمل سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی ایک قسم کی مہارت ہے جس کو انسان سیکھتا ہے اور اس میں پختگی پیدا کرتا ہے، ذیل میں کچھ طریقے ذکر کیے جاتے ہیں جو متحرک انداز میں بچے کی بات سننے اور اس پر توجہ دینے میں مدد کریں گے۔

بچوں کی بات صرف کانوں سے سنیے بلکہ پورے جسم کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوئیے، اس طرح کہ آپ ان ہی کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہوں، آنکھیں، چہرہ اور آواز سب روبرو ہو، جب بچے کی بات سننا ہو تو دوسرے کام چھوڑ دیجئے مثلاً اخبار پڑھنا، موبائل، ٹی وی وغیرہ چھوڑ کر صرف اس کی طرف متوجہ ہوں اور اسی کو دیکھیں، اس طرح آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے سے بھی اجتناب کریں کہ اس پر رعب پڑے، آپ کے اچھے الفاظ اور مناسب جملے صرف کافی نہیں ہو سکتے، اگر بچے کو آپ کے چہرے کے رنگ اور آواز و لہجہ سے یہ احساس ہو گیا کہ آپ اس کی بات سمجھ نہیں رہے ہیں اور نہ اسے کوئی جواب (Response) دے رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ آپ پوری طرح (Actively) اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی بات سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کریں، دوران گفتگو صرف مسکرانا اور ہنسنا ہی کافی نہیں ہوگا، گفتگو کے دوران آپ بچے کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیں یہ اس بات کو مؤکد کرے گا کہ آپ اچھی طرح توجہ سے اس کی بات سن رہے ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حسن استماع اچھے سوالات کرنے پر موقوف ہے، مگر ذرا غور کیجئے کہ سوالات بسا اوقات کس قدر خوف، رعب اور دھمکی کا سبب بنتے ہیں، بلکہ بعض لوگوں کے مطابق سوالات میں بعض اوقات ایک طرح کی سرکشی اور اٹیک کی شکل پائی جاتی ہے، اس لیے اگر آپ بچے سے اچھی طرح گفتگو کرنا چاہتے ہیں تو سوالات کرنا تو بالکل بھی مفید نہیں ہے۔ ہمیشہ اس کی کوشش کیجئے کہ صیغۂ سوال کو ایسی عبارتوں میں تبدیل کر دیجئے، مثلاً ''میں نہیں جانتا کہ اگر تم .....''، ''میں اپنے آپ سے پوچھ رہا ہوں، مگر تمہارا اس سلسلہ میں کیا خیال ہے''، اس طریقے سے آپ اپنا سوال یوں ظاہر کریں گے گویا آپ اس موضوع سے ناواقف ہیں، آپ خود غور کیجئے کہ کون سا جملہ زیادہ مناسب ہے۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ تم ان پیسوں کا کیا کرو گے''، یا پھر یہ کہ ''کیا کرو گے تم ان پیسوں کا'' اگر سوال پوچھنا ہی ضروری ہو تو ''کیا'' اور کیسے بمقابلہ ''کیوں'' ہمیشہ مفید رہے گا، پھر یہ بھی مفید ہوگا کہ بچوں کو جواب دینے کے لیے سوال پر غور کرنے کا موقع دیا جائے۔

حسن استماع کا کبھی کبھی یہ طریقہ بھی مفید ہوگا کہ آپ خاموش رہیں، یا درمیان میں ''ہاں'' ''اچھا'' ''بہتر ہے'' ''اب میں سمجھ گیا'' جیسے ہلکے پھلکے الفاظ بول دیں، یا کبھی ہلکا پھلکا سوال کر لیں، یا اسی کے جیسا کوئی واقعہ نقل کر دیں، آپ بچے کی گفتگو پر کس قدر توجہ دے رہے ہیں اور کس طرح سن رہے ہیں اس کی نوعیت پر آپ کی وہ حوصلہ افزائی دلالت کرے گی، جو آپ دوران گفتگو بچے کی باتوں، افکار کی نوعیت و ترتیب اور فصاحت کلام پر کریں گے۔

کسی کی بات اچھی طرح سننے کا راز یہ ہے کہ آپ اس کے الفاظ و گفتگو کے ماوراء اس کے مقاصد و احساسات کو سمجھ لیں، جو تفصیلات و واقعات متکلم نے نقل کیا اس کے پس منظر تک پہنچ جائیں اور اس کے پیچھے خود متکلم کے کیا احساسات ہیں ان کو پڑھ لیں، یہ بات بہت مفید ہوگی کہ آپ بچے کو اچھی طرح احساس دلائیں کہ آپ پورے طور پر اس کے جذبات سمجھ گئے، اسی کا نام پوری توجہ سے کسی کی بات سننا اور توجہ دینا ہے۔

مؤثر طریقے سے سننا:

مؤثر طریقے سے سننے سے ہماری مراد یہ ہے کہ بچہ آپ سے جو کہہ رہا ہے فی الحقیقت آپ اسے سن رہے ہیں، پھر آپ نے بچے سے جو سنا اس کو آپ اپنے الفاظ میں اس کے سامنے دوہرا رہے ہیں، جس سے آپ یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ آپ اس کی بات سمجھ رہے ہیں اور اس کا بھی اظہار ہے کہ آپ نے اس پر توجہ دی اور اس کے جذبات کا لحاظ کیا، اس طرح سے گویا آپ بھی وہی محسوس کر رہے ہیں جو بچے کا احساس ہے، اب آپ کو کوشش کرنا ہے کہ آپ جو کچھ سمجھے ہیں وہ اس کو سنائیں اور اپنے آپ کو اس کے مقام پر رکھیں، مثلاً:

سعید: میں اب دوبارہ ربیع کے ساتھ ہرگز نہیں کھیلوں گا کیوں کہ وہ بہت مطلب پرست Selfish اور لالچی ہے۔

ماں: لگتا ہے تم اس سے اکتا گئے ہو، پریشان ہو۔

سعید: میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔

ماں: معاملہ یہاں تک پہنچ گیا، گویا تم اس سے بہت پریشان ہو۔

سعید: جی ہاں! میں نے اس کو اپنی سائیکل چلانے کو دی تو اس نے اسے کیچڑ میں گھسا دیا۔

ماں: ہاں! اور تم تو اپنی نئی سائیکل سے بہت زیادہ خوش بھی تھے۔

سعید: جی اماں صحیح کہا آپ نے، اب تو اسے مجھ کو نئے سرے سے اچھی طرح دھلنا پڑے گا۔

یہ گفتگو عجیب وغریب بناوٹی سی لگے گی، فی الحقیقت یہ اسلوب ہمیشہ نہیں استعمال کیا جاتا، البتہ جب متکلم کے جذبات بہت جوش مار رہے ہوں اور احساسات سے مغلوب ہو تو یہ طریقہ مفید ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جب بچہ بہت زیادہ جذبات سے مغلوب ہو تو اسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر وہ اس طرح مؤثر طریقے سے سننے میں کوئی اجنبیت نہیں محسوس کرتا بشرطیکہ ہم س کا صحیح استعمال کریں، اس طریقے سے سب سے پہلے وہ یہ سمجھے گا کہ اس نے معاملہ کو سمجھا، دوسرے مرحلہ میں وہ اپنے ساتھ ہوئے واقعہ کے متعلق رائے قائم کرے گا، تیسرے مرحلہ میں وہ پیش آئی مشکل کے متعلق صحیح اور مناسب حل تلاش کرے گا جیسے کہ سعید نے کہا ''اب تو اسے مجھ کو نئے سرے سے اچھی طرح سے دھونا پڑے گا''، اس طرح کے استماع کے لیے ضروری ہے کہ بچے اور اہل خانہ کے درمیان نقاش وحوار کا دروزہ کھولا جائے، اس سے افراد خانہ کے درمیان مفاہمت اور اعتماد کا ماحول بھی پید اہوگا، بچے کو روانی کلام کی تربیت ملے گی، اسی طرح سے اس کو مشکل ترین مسائل جیسے احساسات و جذبات، جنسی مسائل اور دوستوں سے متعلق گفتگو کرنے کا حوصلہ ملے گا۔ ایک دوسری مثال دیکھئے، ماں نے فاطمہ سے کہہ دیا کہ دیر رات کو تم اپنی سہیلی سے ملنے نہیں جاسکتی۔

فاطمہ: ماں آپ ہمیشہ ''نہیں'' کہتی ہیں، آپ مجھے کبھی مثبت جواب نہیں دیتی ہیں۔

ماں: تم سمجھتی ہو کہ میں انصاف پسند نہیں ہوں، اسی لیے فطری طور پر تم مجھ سے غصہ رہتی ہو۔

فاطمہ: یہ کون سا انصاف ہے؟ آپ تو مجھ پر مسلط رہتی ہیں، ہمیشہ شرطیں لگاتی ہیں، مجھے میری آزادی

نہیں دیتی ہیں۔

ماں: تو تمہارا یہ احساس ہے کہ میں ہمیشہ تمہیں حدود و شرائط میں باندھ کر رکھتی ہوں۔

فاطمہ: جی یہ صحیح ہے۔

ماں: اسی لیے تم ان سب شرطوں سے اکتا گئی ہو۔

فاطمہ: جی صحیح ہے، میرے ساتھ بالکل ننھے بچوں جیسا معاملہ کیا جاتا ہے، بلکہ چھوٹے بچوں کو پھر بھی مجھ سے زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔

ماں: گویا تمہارا احساس یہ ہے کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتی ہوں۔

فاطمہ: بالکل یہی بات ہے، آپ مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں۔

ماں: ایسا لگتا ہے کہ تم مجھ سے بہت بدتمیزی کرنے لگی ہو۔

آپ اس گفتگو میں دیکھ رہے ہوں گے کہ فاطمہ کس قدر جذبات سے مغلوب ہے، یہ صحیح ہے کہ استماع کا یہ اسلوب ایسے ہی موقع پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن غور کیجئے کہ اس گفتگو میں ماں نے بیٹی کی عبارتوں اور اس کی باتوں کو نہیں دوہرایا، بلکہ وہ مسلسل اپنی بیٹی کے جذبات کے برعکس گفتگو کرتی رہی، اس طرح وہ اس مشکل کو حل کرنے میں پوری طرح ناکام رہی، اگرچہ اس نے ماحول کو پرسکون رکھنے میں کامیابی حاصل کی اور بیٹی کو اپنی پریشانی بیان کرنے اور غصہ نکالنے کا پورا موقع دیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ماں کو فوری طور پر نتائج دیکھنے کو نہیں ملیں گے، مگر اس طریقۂ کار کے سبب فاطمہ مستقبل میں ماں کے موقف اور اس پابندی کی موافقت کرنے پر زیادہ قادر ہو جائے گی۔

یہاں آپ ایسے مواقع پر والدین اور نوعمر بچوں یا نوجوان بچوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس کا موازنہ بھی کر سکتے ہیں، جو والدین اچھی طرح اپنے نوعمر بچوں کی گفتگو نہیں سنتے ان کے سامنے کیا صورت حال ہوتی ہے اور مذکورہ بالا دونوں مثالوں میں کیا صورت پیش آئی اور کس طرح گھر کے اندر اچانک تکرار و گفتگو کا سلسلہ ٹوٹا اور خاموشی چھا گئی۔

مؤثر طریقے سے سننا اس وقت بھی مفید ہوتا ہے جب بچے اپنے والدین سے سوال کرتے ہیں اگر والدین کو لگے کہ بچے جو سوال کر رہے ہیں اس کے پیچھے کچھ اور راز ہے، کوئی اور بات ہے، تو بآسانی ان کو جس کا خدشہ ہو اور جو پسِ سوال ان کو محسوس ہو رہا ہو اس کو دوہرا کر یقینی بات میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

مثلاً ولید سوال کرتا ہے ''گھاس ہری کیوں ہوتی ہے'' تو کبھی تو ماں اس سے کو کہتی ہے ''کیا فالتو اور بے کار سوال کرتے ہو'' یا کہتی ہے ''وہ ہمیشہ ہری ہی ہوتی ہے''، البتہ ماں اس سے یوں بھی کہہ سکتی تھی ''مطلب تم یہ پوچھ رہے ہو کہ کیا گھاس کا رنگ کبھی بدلتا بھی ہے''، اب یہ موقع تھا کہ ماں بچے کو سکھائے کہ گھاس کا رنگ موسم کے اعتبار سے بدلتا ہے، اس پر برف پڑے تو سفید ہو جاتی ہے، سوکھ جائے تو مٹیالی ہو جاتی ہے، کیوں کہ بات اگر توجہ سے سنی جائے تو نئے احتمالات پیدا ہوتے ہیں، مؤثر طریقے سے سننا نہ صرف مسائل کے حل میں معاون ہے بلکہ اس سے والدین اور اولاد کے درمیان تعلقات بھی مضبوط ہوتے ہیں اور پھر چونکہ استماع کو صحیح معنی میں توجہ اور ادراک و فہم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ استماع اظہار محبت کا بھی ایک طاقتور ذریعہ ہے۔

آپ ابتدا کیسے کریں:

والدین کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ بچہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر توجہ دیں، پھر ان کلمات اور جملوں کے پیچھے کیا احساسات و جذبات ہیں ان کا اندازہ کرنے کی کوشش کریں، عام طور پر احساسات کی تعبیر کے لیے جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ان کی فہرست تو طویل ہو سکتی ہے مگر ان

میں سے کچھ یہ ہیں:

غصہ، پریشانی، تنگی محسوس کرنا، پریشاں خاطر، مضطرب، خوفزدہ، نرمی، اکتانا، پرسکون، مطمئن، خوشی، خوش بختی، امید ٹوٹنا، خسارہ، غمگین، تھکا ہوا، شرمندہ، جوشیلا، جذباتی، متردد، متحرک، مؤثر، خوشی سے پھولے نہ سمانا، انکار، تنہائی محسوس کرنا، شکر گذار، غیر مفید، رغبت ہونا وغیرہ۔

نیچے ہم کچھ مثالیں دیتے ہیں، آپ دیکھیے کہ بچہ جو جملے بولے گا اس کے پس پردہ کیا ہوسکتا ہے اس کو ہم بین القوسین ذکر کریں گے، مثلاً ایک بچہ کہتا ہے:

- ''مجھے ضرورت نہیں ہے کہ آپ مجھے ہر وقت بتائیں کہ میں کیا کروں'' گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے (کہ اس سے میں تذلیل محسوس کرتا اور لگتا ہے کہ مجھے بہت چھوٹا سمجھا جا رہا ہے، گویا میں کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں)۔
- ''کاش میں اس گھر میں نہ رہتا'' گویا وہ کہنا چاہتا ہے کہ (مجھے غصہ آرہا ہے یا میں پریشان ہوں)۔
- ''مجھے اسکول سے نفرت ہے'' گویا وہ کہنا چاہتا ہے کہ (میں اکتاہٹ محسوس کرتا ہوں، یا مجھے کوئی فائدہ نہیں محسوس ہوتا یا میں خوش بخت نہیں ہوں)۔
- ''میں سو نہیں سکتا'' یعنی وہ کہنا چاہتا ہے کہ (میں تنہائی محسوس کر رہا ہوں یا میں کسی بات سے کچھ پریشان ہوں، یا میں حیرت میں ہوں)۔

''اگر بچوں کے احساسات بالکل واضح ہوں تو بڑوں کو چاہیے کہ وہ بچوں کے سامنے ان احساسات کو دوہرائیں مثلاً ''اچھا تو تم ایسا محسوس کر رہے ہو''، ''اچھا تو تم بہت.....''، ''ایسا لگتا ہے کہ تم.....''، ''میں سمجھتا ہوں کہ تم.....''، اس کا مقصد یہ ہوگا کہ بچہ اور کھلے، اس کے دل میں جو کچھ ہے سب بیان کردے، البتہ یہ کوشش رہے کہ اس نے جس طرح احساسات کا اظہار کیا ہے اس کو کم زیادہ کر کے نہ دوہرائیں، یعنی دوہرانے میں نہ شدت ہو اور نہ تخفیف ہلکا کریں، ورنہ بچہ پھر کھلے گا نہیں اور یوں محسوس کرے گا کہ اس کی بات سمجھی نہیں گئی، بچے کی بات کو اچھی طرح سننا نہ صرف اولاد کے لیے مفید ہے بلکہ اس سے والدین بھی بچوں کے قریب ہوتے ہیں اور تعلق ومحبت میں اضافہ ہوتا ہے، کبھی کبھی اسی تناظر میں والدین کو کچھ مزاح بھی کر لینا چاہیے، مثلاً بچہ شکایت کرے کہ اس کی بہن نے مٹھائی کا بڑا ٹکڑا لے لیا ہے تو والدین کہہ سکتے ہیں: ''ارے عدنان، اصل میں ہم سلوی کو تم سے زیادہ چاہتے ہیں اس لیے اس کو ذرا بڑا ٹکڑا دے دیا''۔

آخری بات یہ ہے کہ اچھے اور مؤثر انداز میں سننے کے اس عمل میں بہتری لانے میں کچھ وقت لگے گا، جیسے دوسری چیزوں میں لگتا ہے، ابتدا میں تو یہ چیز مصنوعی اور اجنبی سی لگے گی لیکن ذرا صبر اور مشق کے ساتھ یہ عمل والدین کے لیے فطری عمل بن جائے گا۔

ذرا نیچے دیے گئے بچوں کے جملے پڑھیے اور غور کیجیے ان جملوں پر بڑوں کا ردِّعمل کیا ہوتا ہے، پھر خود ہی سوچیے کہ جب بچہ یہ جملے بولتا ہے تو درحقیقت اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں:

- میں مدرسہ نہیں جانا چاہتا۔
- آپ مجھ پر بالکل توجہ نہیں دیتے میرے ساتھ جو ہوتا ہے اس پر بھی دھیان نہیں دیتے۔
- اسکول میں جو میری ٹیچر ہیں وہ بہت سخت ہیں۔

والدین اگر اپنے آپ سے یہ سوال کریں تو فائدہ ہوگا:

- میں اس ہفتہ اپنے کون سے بچے کی بات اچھی طرح سننے پر دھیان دوں گا۔
- اس کام کے لیے زیادہ مناسب وقت کون سا ہے مثلاً (کھانے کے بعد کا یا سونے کے وقت)

- میں کیسے شروع کروں؟
- میں اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کیا کہوں؟ اس میں اعتماد کا احساس کیسے پیدا کروں جس سے وہ مطمئن ہو اور مزید کھل کر بات کرے؟

مثالیں اور عملی موقف:

- دس سالہ اسماء کہتی ہے کہ میرے پاس کوئی کام نہیں ہے میں کیا کروں؟ میں اپنی دوست سُعاد سے پوچھنے گئی تھی مگر وہ گھر پر ہے نہیں معلوم ہوا کہ وہ گرمی کی چھٹی میں کہیں گئی ہے۔

والد: بہتر ہے، مگر ہمیشہ تم اس کے علاوہ کسی اور کو ہی پاتی ہو جس کے ساتھ کھیلتی ہو۔

آپ کا کیا خیال ہے اسماء جب گھر لوٹی تو اس کا کیا احساس ہوگا؟ اور اس کے والد کی بات کا اس پر کیا اثر پڑا ہوگا؟ اور کس طرح ان کے لیے ممکن تھا کہ مؤثر طریقے سے سنتے تا کہ پتہ چلتا کہ وہ اچھی طرح سمجھے ہیں۔

- ۱۲/سالہ بلال کہتا ہے، میں اپنے استاد سے نفرت کرتا ہوں، جن اساتذہ سے بھی اب تک میرا سابقہ پڑا ان میں وہ سب سے مشکل ٹیچر ہے، میں تو سوچتا ہوں کاش وہ مرجاتے۔

ماں: ارے بلال اس طرح کی گفتگو کسی بھی انسان کے بارے میں معیوب ہے، پھر وہ تو استاذ ہیں، اگر وہ تمہارے ساتھ سختی کرتے ہیں تو ضرور تم نے کوئی غلطی کی ہوگی۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ بلال مدرسے، مدرس اور اپنے بارے میں کیا احساس رکھتا ہے؟ اور ماں کی گفتگو کا اس پر کیا اثر پڑا ہوگا؟ اور ماں مؤثر استماع کے ذریعہ کس طرح اس کی مدد کرسکتی تھی کہ وہ اپنی ذات اور اپنے احساسات کے متعلق بہتر طریقے سے اظہار خیال کرتا۔

- پانچ سالہ عمر بالکل روہانسا ہوکر کہتا ہے، مجھے سمیر اور صلاح نے اپنے ساتھ کھلانے سے منع کردیا، دونوں کہہ رہے ہیں تم ہٹ جاؤ تم ابھی چھوٹے ہو۔

ماں: عمر پریشان مت ہو، غمگین نہ ہو، ان جیسے دوستوں کے بغیر بھی تم بہت بہتر ہو۔

آپ سوچئے کہ اگر آپ عمر کی جگہ ہوں اور یہی سلوک آپ کے دوست آپ کے ساتھ کریں تو آپ کا کیا احساس ہوگا اور ماں کی بات کا اس پر کیا اثر ہوگا آپ کے خیال میں؟ اگر ماں اس کے جذبات پر پوری طرح متوجہ ہوتی اور اس کی بات سنتی تو اور کس طرح بہتر طریقے سے اس کی مدد کرپاتی؟

- دس سالہ بچہ زہیر آدھا گھنٹہ اپنے اسکول کا کام کرنے کے بعد کہتا ہے، آج یہ ہوم ورک میرے لیے بہت مشکل ہے، میں تو اکتا گیا، میں اب چھوڑ دوں گا اس کو۔

ماں: تم اس کو پورا کرنے سے پہلے اس طرح چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ پھر تو تم بہت دیر بعد بھی اس کو لے کر نہیں بیٹھو گے اس لیے مسلسل کوشش کرکے اس کو مکمل کرلو۔

آپ کیا سمجھتے ہیں زہیر نے اپنے ہوم ورک کے متعلق کیا محسوس کیا؟

آپ زہیر کی جگہ ہوتے تو آپ پر ماں کی باتوں کا کیا اثر پڑتا؟

کیا ماں اگر اچھے طریقے سے اس کی بات کو سنتی اور سمجھتی تو اس کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس کو آگے بڑھنے میں مدد کرتی؟

- ۱۷/سالہ علی کہتا ہے کہ کل میرے دوست نے مجھے اپنے گھر بلایا ہے۔

والد: لیکن یہ سوچ لو کہ ہر حال میں تم کو جلدی گھر لوٹنا ہے۔

اب آپ سوچئے علی اس دعوت کے بارے میں کیا سوچ

رہا ہوگا؟

اس کے والد کی گفتگو نے اس پر کیا اثرات مرتب کیے ہوں گے؟

کیا والد کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اچھی طرح اس کی بات سنتے اور مؤثر انداز میں جواب دیتے؟

اہل خانہ کے لیے ہدایات:

کچھ متعین لمحات ایسے ہوتے ہیں جس میں انسان کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے، صرف اور صرف بچوں پر توجہ دے، ان کی بات سننے کے لیے بیٹھ جائے، مثال کے طور پر جب بچہ اسکول سے واپس آئے تو ضرور فارغ ہو کر متوجہ ہونا چاہیے خواہ اس سے بات کرنے کے لیے کچھ نہ ہو، اسی طرح سونے کے لیے بستر پر جاتے وقت، اسی طرح اس وقت جب کسی چیز سے بچہ بہت پریشان ہو، ملول خاطر ہو، حتی کہ خوشی سے مغلوب ہو تب بھی اس کی طرف کچھ دیر کے لیے متوجہ ہو جانا چاہیے۔

عام طور پر اہل خانہ بچے کی بات اچھی طرح سننے یا اس کے کھل کر بولنے کا دروازہ اس طرح بند کر دیتے ہیں کہ اس سے جرح کرنے لگتے ہیں یا نصیحتیں کرنے لگتے ہیں یا بہت زیادہ سوال کرتے ہیں یا اس کا مذاق بنانے لگتے ہیں، یہ تمام ہی چیزیں والدین اور بچوں کے درمیان خط فاصل ثابت ہوتی ہے، اس لیے اہل خانہ کے لیے اس بابت غور وفکر مفید ہوگا کہ یہ امور کس طرح کم سے کم پیش آئیں۔

مثلاً جب بچہ اپنا کھلونا ٹوٹ جانے یا بہن کے بال نوچ لینے یا کوئی دوست نہ ہونے کے سبب اکتانے کی وجہ سے روتا ہے، تو ایسے مواقع پر اس کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، وہ یہ کہ والدین اس کی بات کو اچھی طرح سنیں، تاکہ اس کو یہ احساس ہو کہ کوئی ہے جو اس کی بات سمجھ رہا ہے، لیکن افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ اکثر والدین ایسے موقع پر تیزی سے کوئی حل تلاش کرتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ حسن استماع اس مشکل کے حل کا پہلا بلکہ بنیادی اور سب سے آسان مرحلہ ہے۔

جب آپ بچے کی بات سننے لگیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ اس کے معیار پر اتر آئیں، اس سے اس کو آسانی سے بات کرنے میں مدد ملے گی۔ مطلب یہ کہ آپ اس کے ساتھ بیٹھ جائیں یا اس طرح تھوڑا جھک جائیں کہ اس کے برابر آجائیں اس سے اس کو اطمینان محسوس ہوگا اور قرب کا احساس ہوگا اور اس کو لگے گا کہ آپ بڑے اہتمام سے اس کی گفتگو سن رہے ہیں۔

جب بچہ پریشاں خاطر یا غمگین ہو تو اس کی بات سننے کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کو چمٹا لیں، بازوؤں میں بھر لیں، محبت سے سینے سے لگا لیں تاکہ کچھ آنسو بہا کر اسے اپنے جذبات کے اظہار کا موقع ملے۔

اسی طرح بعض مختصر الفاظ اور جملوں سے اثناء گفتگو آپ بچے کی حوصلہ افزائی بھی کر سکتے ہیں، مثلاً ''ہاں''، ''اچھا''، ''اوہ یہ بات ہے میں سمجھ گیا''، ''لگتا ہے تم اس سے متاثر ہو''، یہ انداز فوراً بہت سے سوالات کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

اگر آپ کو کوئی سوال کرنا پڑے تو آپ بچے کے احساسات اور موقع وحالات کا خیال کرتے ہوئے بہت نرمی کے ساتھ سوال کریں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ یہ اسلوب استعمال کریں ''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا کیا خیال ہے یا تمہاری کیا رائے ہے''، ''مجھے نہیں معلوم کہ تم.....''۔

مؤثر طریقے سے سننے کے لیے مندرجہ ذیل امور پر عمل کیا جاسکتا ہے:

۱- احساسات وجذبات کو سمجھئے۔

۲- جب بچہ آپ سے گفتگو کرنے لگے تو آپ کوشش کیجئے کہ بچے کے احساس کو کوئی نام دیجئے۔

۳- بچے کو اچھی طرح اس کی بات دوہرا کر یہ

احساس دلایئے کہ آپ اس کے احساس تک پہنچ گئے ہیں۔

۴- اگر آپ کو لگے کہ آپ اس کی بات نہیں سمجھ سکے ہیں تو اسے اظہار خیال کا مزید موقع دیجئے تاکہ وہ اپنی بات اچھی طرح سمجھا سکے۔

یہ یاد رہے کہ بچہ جیسے ہی کوئی خطا کرے فوراً اس کی تصحیح کی کوشش کبھی بھی مفید نہیں ہوتی، بالخصوص اس وقت جبکہ آپ اس کے کسی رویہ سے ناراض ہوں، نصیحت و تصحیح خطا کا عمل ہمیشہ مؤخر کر دینا اور ایسے وقت میں کرنا مفید ہوتا ہے جب ماحول بالکل پرسکون ہو۔ ظاہر ہے طوفان برپا ہو، آندھی چل رہی ہو، مصیبت درپیش ہو تو ایسے وقت میں کوئی نصیحت کیوں کر مفید ہوسکتی ہے، اس طرح کا کوئی جملہ اور کوئی انداز کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتا، مثلاً ''میں نے تم سے پہلے ہی بار بار کہا ہے کہ تم ایسا ہرگز نہیں کیا کرو''۔

بعض والدین کے تاثرات و تبصرے:

● جب میری بیٹی کو یہ محسوس ہوا کہ میں اس کی بات پوری طرح سمجھ گئی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ یہ سمجھتی تھی کہ بڑے بچوں بالخصوص نو عمروں (جیسے ۱۲/ ۱۳/ سال والوں) کی بات نہیں سمجھ سکتے، مجھے لگتا ہے کہ میرے اور اس کے درمیان جو خلیج تھی وہ ختم ہونا شروع ہوگئی ہے۔

● میری ایک دوست ہے، دینی اور تہذیبی فرق کے باوجود ہم دونوں کا خیال یہ ہے کہ بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں ہم دونوں یکساں قسم کی پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے دوچار رہیں۔

● میں نے ''حسن استماع'' کے طریقے کو بہت مفید محسوس کیا حتی کہ اپنی دادی کے ساتھ بھی اس کا بڑا اچھا تجربہ رہا اور اپنے تینوں بچوں کے ساتھ تو اس کا بڑا کامیاب تجربہ رہا، پہلے میں اپنے بچے سے کہا کرتا تھا، ''چلو فوراً یہ رونا دھونا بند کرو، مگر اب میں اس کو اپنے سینے سے چمٹا لیتا ہوں، اس کے جذبات و احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں اور اب میں اس سے یوں کہتا ہوں: ''لگتا ہے تم کچھ ملول خاطر ہو'' تو وہ مجھ سے اور قریب ہوتا ہے اور مزید روتا ہے، اس میں کچھ دیر تو لگتی ہے مگر پھر وہ چپ ہو جاتا ہے اور بالکل بھی اس کی پریشانی باقی نہیں رہتی، اگلے مرحلہ میں تھوڑی ہی دیر بعد وہ پہلے سے زیادہ پرسکون اور خوش خرم ہو جاتا ہے۔

● فی الحقیقت جس کو مؤثر انداز استماع کہا جاتا ہے وہ مجھے غیر فطری طریقہ لگتا ہے، عموماً لوگ بچوں سے اس انداز میں گفتگو نہیں کرتے، میرے بچے اس کے عادی نہیں ہوئے ہیں، اس لیے جب ان کے ساتھ میں یہ انداز اپناتی ہوں تو انھیں اپنی ماں میں ہی کچھ خلل محسوس ہونے لگتا ہے۔

● حسن استماع پر عمل کرنے سے مجھے بڑا سکون ملا، جب میں نے توجہ اور اہتمام سے اپنے بچے کی بات سننا شروع کی تو مجھے اس کے برتاؤ میں بھی بہتری محسوس ہوئی۔ چنانچہ جہاں وہ پہلے تھکا تھکا رہتا تھا وہیں اب وہ خوش خرم رہتا ہے، اب اس کو اس کی ضرورت نہیں پڑتی کہ میں اس کو بتاؤں کہ اس کو کیا کرنا ہے بلکہ اب وہ خود ہی اپنے کام کرتا ہے۔

● میرے بچے نے جب اپنا کھلونا توڑ دیا تو وہ اس امید میں تھا کہ میں حسب عادت غصہ دکھاؤں، لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو چمٹا لیا، اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اور رونا شروع کر دیا، جب میں نے اس سے کہا ''کھلونا ٹوٹنے سے واقعی تم غمگین ہو'' تو اس نے اور زور سے رونا شروع کر دیا، تھوڑی دیر بعد اس کے آنسو رک گئے، اس کا دل مطمئن ہوگیا اور وہ پرسکون ہوگیا۔ مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ میں نے اس کی بپتا سنی اور اس کے احساسات کو محسوس کیا اور میں نے اس کے احساسات سے چھٹکارا پانے اور بھڑاس نکالنے میں اس کی مدد کی، اس طرح ایک کھلونے کے ٹوٹنے سے ہم دونوں دور ہونے کے بجائے قریب ہوگئے۔

چوتھا جدول

مناسب اور نامناسب برتاؤ کی درج ذیل مثالوں کو دیکھیے کہ بچے سے کیا کہنا ممکن ہوتا ہے، ہم نے ''اچھی طرح سننے'' کے کالم میں والدین کے موقف کو ذکر کیا ہے، یہ ملحوظ رہے کہ موقع ومحل اور حالات کے اعتبار سے الفاظ کچھ مختلف ہو سکتے ہیں:

بچے کی گفتگو	نامناسب برتاؤ	اچھی طرح سننا (حسنِ استماع)
مجھے یہ نہ بتائیے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔	ہاں! میں تمہیں بالکل بتاؤں گا میں تمہارا والد ہوں تمہارے لیے یہ ضروری ہے کہ جو میں کہوں وہی تم کرو۔	ایسا لگتا ہے کہ جب تم سے کچھ کرنے کے لئے کہتا ہوں تو تم کو ناراض کر دیتا ہوں۔
میں سالم کو ناپسند کرتا ہوں، میں اب دوبارہ اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔	بیٹا! تمہارے لیے ضروری ہے کہ تم لوگوں سے نفرت نہ کرو، میں تم سے بار بار کہہ رہی ہوں کہ اس نے تمہارے ساتھ جان بوجھ کر کچھ برا نہیں کیا۔	مجھے لگتا ہے کہ تم اپنے بھائی سے کچھ ناراض ہو۔
میری میتھ اچھی نہیں ہے یا میں میتھ میں بہت کمزور ہوں۔	لیکن میتھ تو بہت آسان ہے، تم اس کو سیکھتے کیوں نہیں؟ اور اس میں زیادہ محنت کیوں نہیں کرتے۔	ایسا لگتا ہے کہ تم میتھ کو بہت مشکل سمجھتے ہو، اسی لیے تم کو اس میں دلچسپی نہیں ہے۔
میں کیوں نہیں جا سکتا اس کی طرح، وہ مجھ سے ایک ہی سال تو بڑا ہے بس۔	میں نے جو کہہ دیا وہ کافی ہے بس، موضوع ختم۔ اب ہم اس پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔	ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم کو کچھ ناانصافی لگ رہی ہے، گویا تمہاری کچھ حق تلفی ہوئی ہے۔
ہماری کھیل کی ٹیم کامیاب ہوگئی امی!	اچھا ہے، چلو جاؤ اب ہاتھ دھولو	اچھا ہے، ضروری ہے کہ تم اس رزلٹ کو اپنے لیے خوش نصیبی سمجھو۔
بچہ روتے ہوئے کہتا ہے کہ میری نئی گڑیا کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔	روؤ نہ بیٹا ہم تم کو ایک اور خرید دیں گے۔	اوفوہ بہت افسوس کی بات ہے، تم اپنی نئی گڑیا پا کر بہت خوش تھے، ظاہر ہے اب تم کو اس کا غم تو ہوگا۔

☆☆☆

❑ بحث و تحقیق

قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ اور کامیابی کی شاہ کلید

تحریر: مولانا ابوالکلام آزاد
ترتیب وتلخیص: عبدالرشید طلحہ نعمانی

تم کرۂ ارض کی کوئی قوم لے لو اور زمین کا کوئی ایک قطعہ سامنے رکھ لو، جس وقت سے اس کی تاریخ روشنی میں آئی ہے اس کے حالات کا کھوج لگاؤ تو تم دیکھو گے کہ اس کی پوری تاریخ کی حقیقت اس کے سوا کچھ ہے کہ وارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے یعنی ایک قوم قابض ہوئی پھر مٹ گئی اور دوسری وارث ہوگئی، پھر اس کے لیے بھی مٹنا ہوا اور تیسرے وارث کے لیے جگہ خالی ہوگئی۔ وھلم جرا۔۔۔۔قرآن کہتا ہے یہاں وارث و میراث کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب سوچنا یہ چاہیے کہ جو ورثہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں اور جو وارث ہوتے ہیں کیوں وراثت کے حق دار ہو جاتے ہیں۔ فرمایا اس لیے کہ یہاں خدا کا ایک اٹل قانون کام کر رہا ہے کہ: زمین کے وارث خدا کے بندے ہوتے ہیں۔(الانبیاء:105)

یعنی جماعتوں اور قوموں کے لیے یہاں بھی یہ قانون کام کر رہا ہے کہ انہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرماں پذیری آتی ہے جو نیک ہوتے ہیں، صالح ہوتے ہیں۔ صلح کے معنی سنوارنے کے ہیں۔ فساد کے معنی بگڑنے اور بگاڑنے کے ہیں۔ صالح انسان وہ ہے جو اپنے کو سنوار لیتا ہے اور دوسرے میں سنوارنے کے استعداد پیدا کرتا ہے اور یہی حقیقت بدعملی کی ہے۔ پس قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت سنورنے اور سنوارنے والوں کے حصے میں آتی ہے، ان کے حصے میں نہیں جو اپنے اعتقاد و عمل میں بگڑ جاتے ہیں اور سنوارنے کی جگہ بگاڑنے والے بن جاتے ہیں۔

تورات، انجیل اور قرآن تینوں نے وراثت ارض کی ترکیب جا بجا استعمال کی اور غور کرو یہ ترکیب صورت حال کی کتنی سچی اور قطعی تعبیر ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یعنی ایک فرد اور ایک گروہ طاقت واقتدار حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ چلا جاتا ہے اور دوسرا فرد یا گروہ اس کی ساری چیزوں کا وارث ہو جاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں، محض ایک ورثہ ہیں؛ جو ایک گروہ سے نکلتا ہے اور دوسرے گروہ کے حصہ میں آجاتا ہے۔ پس قرآن کہتا ہے ایسا کیوں ہے، اس لیے کہ وراثت ارض کی شرط اصلاح وصلاحیت ہے، جو صالح نہ رہے ان سے نکل جائے گی، جو صالح ہوں گے ان کے ورثہ میں آئے گی۔ اور تم خدا کی عادت میں ہرگز تبدل نہ پاؤ گے اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔(فاطر:43)

بقائے انفع کا قانون:

سورۃ رعد میں فرمایا گیا: اسی نے آسمان سے مینہ برسایا پھر اس سے اپنے اپنے اندازے کے مطابق نالے بہہ نکلے پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔ اور جس چیز کو زیور یا

کوئی اور سامان بنانے کے لیے آگ میں تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی جھاگ ہوتا ہے۔ اس طرح خدا حق اور باطل کی مثال بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے۔ اور (پانی) جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح خدا (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)۔ (الرعد:17)

تو یہ جو کچھ بھی ہے، حق و باطل کی آویزش ہے؛ لیکن حق اور باطل کی حقیقت کیا ہے؟ کونسا قانون ہے جو اس کے اندر کام کر رہا ہے؟ یہاں واضح کیا گیا کہ یہ بقاء انفع کا قانون ہے یعنی اللہ نے قانون ہستی کے قیام واصلاح کے لیے یہ قانون ٹھہرایا ہے کہ یہاں وہ چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں نفع ہو؛ جس میں نفع نہیں وہ نہیں ٹھہر سکتی، اسے نابود ہو جانا ہے ؛ کیوں کہ کائنات ہستی کا یہ بناؤ، یہ حسن، یہ ارتقاء قائم نہیں رہ سکتا، اگر اس میں خوبی کی بقاء اور خرابی کے ازالے کے لیے ایک اٹل قوت سرگرم کار نہ رہتی۔ یہ قوت کیا ہے؟ فطرت کا انتخاب ہے، فطرت ہمیشہ چھانٹتی رہتی ہے، وہ ہر گوشہ میں صرف خوبی اور برتری ہی باقی رکھتی ہے، فساد اور نقص محو کر دیتی ہے۔ ہم فطرت کے اس انتخاب سے بے خبر نہیں ہیں، قرآن کہتا ہے اس کارگاہ فیضان و جمال میں صرف وہی چیز باقی رکھی جاتی ہے جس میں نفع ہو؛ کیوں کہ یہاں رحمت کارفرما ہے اور رحمت چاہتی ہے کہ افادۂ فیضان ہو، وہ نقصان گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ کہتا ہے: جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ فطرت چھانٹتی ہے؛ جو چیز نافع ہوتی ہے اسے باقی رکھتی ہے اور جو نافع نہیں ہوتی اسے محو کر دیتی ہے۔ ٹھیک ٹھیک عمل ایسا ہی معنویات میں بھی جاری ہے جو عمل حق ہوگا قائم اور ثابت رہے گا، جو باطل ہوگا مٹ جائے گا اور جب کبھی حق و باطل کا مقابلہ ہوگا تو بقاء حق کے لیے ہوگی نہ کہ باطل کے لیے۔ وہ اسی کو قضاء بالحق سے تعبیر کرتا ہے یعنی فطرت کا فیصلہ حق جو باطل کے لیے نہیں ہو سکتا۔

ہمارے زوال کا ایک اہم سبب:

عمران وتمدن کے تمام اصولوں اور قوانین کا متن قرآن کا ہی اصل اصول ہے اسی اصول کی ہمہ گیری ہے کہ امم قدیمہ کے حالات ہم پڑھتے ہیں تو ہر قوم کا ایک دور عروج ہمارے سامنے آتا ہے اور دوسرا زمانہ انحطاط۔ ان دونوں میں مابہ الامتیاز اور فاصل اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو وہ قیام عدل اور نفاذ جور و جفا ہے۔

جب تک قومیں قیام عدل میں مساعی اور جدوجہد کرنے والی ہوتی ہیں تو فتح و کامرانی نصرت الٰہی و کامیابی ان کے قدم چومتی ہے؛ لیکن جب قیام عدل کے بجائے افشاء ظلم اور ترویج جور وستم ان کا شعار بن جاتا ہے تو پھر قانون فطرت حرکت میں آتا ہے اور بیک جنبش ان کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتا ہے اور پھر ان کا نام ونشان تک باقی نہیں رہتا۔

دور جانے کی ضرورت نہیں خود اپنی تاریخ کو اٹھا کر دیکھو! جب تک ہم دنیا میں حق اور انصاف کے حامی و مددگار رہے تو خدا تعالیٰ بھی ہمارا مددگار رہا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی ہمارے سامنے نہ ٹھہر سکی؛ لیکن جوں ہی تاریخ اسلام کا عہد تاریک شروع ہوا اور علم و مذہب، اعلان حق اور دفع باطل کے لیے نہ رہا؛ بل کہ حصول عز و جاہ اور حکومت وتسلط کے لیے آلہ کار بن گیا اور اس طرح علم و مذہب حصول قوت حکمرانی اور دولت جاہ دنیوی کا ذریعہ بن گیا تو اجتماعی فسادات اور امراض کے چشمے پھوٹ پڑے۔ حکام عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے لگے اور علماء اور فقہاء ان کے درباروں کی زینت بن گئے تو قوت حاکمۂ کائنات کے دست قدرت نے بھی استبدال اقوام اور انتخاب ملل کے فطری قانون کو حرکت دی اور عمل بالمحاذات کے دستور اٹل کو عمل میں لائی تو پھر ہمارے ادبار اور شقاوت کو نہ ہماری حکومت روک سکی اور نہ ہی عسکری قوت۔ رسوائی و ذلت

کے اس بحر متلاطم کے تھپیڑوں سے نہ علماء و مشائخ بچ سکے اور نہ عمال اور زہاد۔ آج جتنی رسوائے عالم، مسلمان قوم ہے شاید ہی کوئی قوم اس درجہ مغضوب و مقہور ہوئی ہو۔ وتلك الايام نداولها بين الناس (3:140)

ماضی اور حال:

یہ انقلاب قدرتی ہے اور نہیں معلوم اس دنیا میں کتنے دور قوموں اور ملکوں پر اس کے گذر چکے ہیں۔ آج امید و کامیابی کے جس آفتاب سے غیروں کے ایوانِ اقبال روشن ہو رہے ہیں، کبھی ہمارے سروں پر بھی چمک چکا ہے اور جس بہار کے موسم عیش و نشاط سے ہمارے حریف گذر رہے ہیں، ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باغ و چمن ہی میں اس کے جھونکے آیا کرتے تھے۔ اب کس سے کہیے کہ کہنے کا وقت ہی چلا گیا۔

گذر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

ہم ہمیشہ سے ایسے نہیں جیسے کہ اب نظر آ رہے ہیں، زمانہ ہمیشہ ہم سے برگشتہ نہیں رہا، مدتوں امید کا ہم میں آشیانہ رہا ہے؛ بلکہ ہمارے سوا اس کا کہیں ٹھکانہ نہ تھا، اب دنیا میں ہمارے لیے ماتم و ناامیدی، دو ہی کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں؛ لیکن زیادہ دن نہیں گذرے کہ ہماری زندگی کے لیے اس دنیا میں اور بھی بہت سے کام تھے۔

اور ہم نے ان قوموں کو اچھی اور بری امید اور مایوسی، فتح اور شکست دونوں حالتوں میں ڈال کر آزمایا کہ شاید یہ بداعمالیوں سے توبہ کریں اور راہ حق بھی اختیار کر لیں۔ (الاعراف:168) بے شک اس انقلابی حالت میں عبرت و موعظت کی بہت سی نشانیاں ہیں؛ مگر ان میں اکثر لوگ ایمان و ایقان کی دولت سے محروم تھے۔

ہجوم یاس و اختلالِ نظامِ امید:

جو شخص مایوس ہو کر اللہ کی نسبت ایسا ظن رکھتا ہو کہ اب دنیا و آخرت میں خدا اس کی مدد کرے ہی گا نہیں، تو پھر اس کو چاہیے کہ اوپر کی طرف رسی تانے اور اس کا پھندا بنا کر اپنے گلے میں پھانسی لگا لے اور اس طرح زمین سے جہاں اب وہ اپنے لیے مایوسی سمجھتا ہے، اپنا تعلق قطع کر لے پھر دیکھے کہ آیا اس تدبیر سے اس کی وہ شکایت جس کی وجہ سے مایوسی ہو رہی ہو، وہ دور ہو گئی یا نہیں۔ اس طرح ہم نے قرآن کریم میں ہدایت فلاح کی روشن دلیلیں اتاری ہیں کہ تم ان پر غور کرو۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اس کے ذریعے سے ہدایت بخشتا ہے۔ (الحج:16)

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

جنگ بلقان اور جنگ اسلام و فرنگ کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں شاید سب سے زیادہ موثر اور درد انگیز باب مسلمانانِ عالم کے اضطراب امید و بیم کا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ میدان جنگ میں صرف مجاہدین ترک تھے؛ لیکن ہزاروں ہیں جنہیں خواب غفلت سے مہلت نہیں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں جو گو اب تک بستروں پر لیٹے ہیں مگر اضطراب کی کروٹیں بھی بدل رہے ہیں اور یہ یقیناً کارفرمائے قدرت کی ایک سب سے بڑی توفیق بخشی ہے، اگر موسم کے بدلنے کا وقت آ گیا ہے تو اتنے آثار بھی کم نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے آتش کدوں اور تنوروں کو دیکھا ہے، ان کے اندر آگ کے مہیب شعلے اٹھ رہے تھے۔ حالاں کہ چند گھنٹے پیشتر ان کی تہہ میں چند بجھی ہوئی چنگاریوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی خاکستر کے تودوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو جب باد تند و تیز کے چند جھونکے میسر آ گئے تو چشم زدن میں دہکتے ہوئے انگاروں اور اچھلتے ہوئے شعلوں سے تنور بھر گیا۔ پھر کیا عجب ہے کہ سوز تپش کی جو چنگاریاں اس وقت دلوں میں بجھی ہوئی نظر آ رہی ہیں توفیق الٰہی کی باد شعلہ افروز ان کے اس آتش کدہ حیات کو گرم کر دے جو افسوس ہے کہ روز بروز خاکستر سے بھرتا جا رہا ہے۔

اس بارے میں میری زبان پر صاف صاف

سوالات ہیں۔ کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ امید و یاس کی تقسیم میں ایک ہمارے لیے صرف یاس ہی رہ گئی ہے اور تکمیل فنا میں جس قدر وقت باقی رہ گیا ہے اس میں صرف رفتہ کا ماتم اور آئندہ کی نا میدی دو ہی کام کرنے کے لیے باقی رہ گئے ہیں؟؟

کیا جو کچھ ہو رہا ہے ، ہماری زندگی کی آخری مساعات اور موت کے احتضار کی آخری حرکت ہے؟؟؟

کیا چراغ میں تیل ختم ہو گیا اور بجھنے کا وقت قریب ہے اور سب سے آخر یہ کیا اعداء اسلام سے اسلام کا آخری مقابلہ ہو چکا ہے اور یسوع کی مصلوب اور مردہ لاش نے خدائے حی وقیوم پر فتح پالی ہے؟؟؟؟۔معاذاللہ

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوالات مختلف شکلوں میں آج بہتوں کے سامنے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ مایوسی کا غلبہ میرے اعتقاد کو مغلوب کرے، اس لیے ممکن ہے کہ میں تسلیم کرلوں کہ ہمارے مٹنے کا وقت آ گیا ہے؛ مگر میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلم قلب جس میں ایک ذرہ برابر نور اسلام باقی ہے ایک منٹ، ایک لمحہ ایک دقیقے اور ایک عشیرہ دقیقے کے لیے بھی اس کو مان سکتا ہے۔

حیران ہوں کہ آج مسلمان مایوس ہو رہے ہیں؛ حالاں کے میں تو کفر و مایوسی کے تصور سے کانپ جاتا ہوں، کیوں کہ یقین کرتا ہوں کہ مایوس ہونا اس خدائے ذوالجلال والاکرام کی شان رحمت و ربوبیت کے لیے سب سے بڑا انسانی کفر اور اس کی جناب میں سب سے زیادہ نسل آدم کی شوخ چشمی ہے۔ تم جو اِن بربادیوں اور شکستوں کے بعد مایوس ہو رہے ہو تو بتلاؤ کہ تم نے خدائے اسلام کی قوت و رحمت کو کس پیمانہ سے ناپا۔ وہ کون سا کاہن ابلیس ہے جس نے خدا کے خزانہ رحمت کو دیکھ کر تمہیں بتلا دیا ہے کہ اب اس میں تمہارے لیے کچھ نہیں۔

سورۂ عصر اور کامیابی کی چار منزلیں:

قوموں کی زندگی ایک بہت بڑی علامت یہ ہے کہ ان کا دل امید کا دائمی آشیانہ ہوتا ہے اور خواہ ناکامی اور مصائب کا کتنا ہی ہجوم ہو؛ مگر امید کا طائر مقدس ان کے گوشے سے نہیں اڑتا، وہ دنیا کو ایک کارگاہ عمل سمجھتے ہیں اور امید کہتی ہے کہ یہاں جو کچھ ہے صرف تمہارے لیے ہے۔ اگر آج تم اس پر قابض نہیں تو غم نہیں کیوں کہ عمل و جہد کے بعد کل کو وہ تمہارے ہی لیے ہونے والی ہے۔ مصیبتیں جس قدر آتی ہیں وہ ان کو صبر و تحمل کی ڈھال پر روکتے ہیں اور غم و اندوہ سے اپنے دماغ کو معطل نہیں ہونے دیتے بلکہ مصیبتوں کو دور کرنے اور ان کی صفوں پر غالب آنے کی تدابیر پر غور کرتے ہیں، نامرادی ان کے دلوں کو مجروح کرتی ہے مایوس نہیں کرتی اور غم کے لشکر سے ہزیمت اٹھاتے ہیں، پر بھاگتے نہیں۔

گردش زمانہ شاہد ہے کہ ہر جماعت خسارہ میں گھری ہوئی ہے ؛ مگر وہی جو یہ چار کام انجام دیں۔ ایمان لائیں اور عمل صالح کریں، حق وصداقت کا اعلان کرتے رہیں اور صبر کی تلقین کریں۔

زمانہ اس لیے شاہد ہے کہ اس آسمان کے نیچے قوموں اور جماعتوں کی بربادی و کامیابی اور ارتقاء وانحطاط کی کہانی جتنی پرانی ہے اتنا ہی پرانا زمانہ بھی ہے۔ دنیا میں اگر کوئی اس انقلاب اقوام کا ہم عصر ہوسکتا ہے تو وہ صرف زمانہ ہے۔ پھر قوموں کی تباہی و بربادی اور کامیابی وفلاح جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے وہ زمانہ کی گود میں ہوا۔ پس انقلاب امم پر اگر کوئی چیز گواہ ہوسکتی ہے تھی تو وہ صرف گردش ایام ہی تھا؛ اس لیے قرآن نے زمانہ کو اس پر شاہد اور گواہ بنایا کہ زمانہ اور اس کی گردش ورفتار اس بات پر شاہد ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ان اصول چہارگانہ کو نہ اپنا لے۔ پس قرآن اعلان کرتا ہے کہ اس آسمان کے نیچے نوع انسان کے لیے انسانوں کی تلاشوں اور جستجوؤں کے لیے اور امیدوں و تمناؤں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں گھاٹے اور ٹوٹے

ہیں، خسران اور نامرادی ہے، محرومی اور بے مرادی ہے؛ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے جو کہ بچ سکتی ہے اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی اور ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے۔ وہ کون انسان ہیں، وہ انسان جو کہ دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً وعملاً اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوں گی، اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہوسکتی اور نہ ملک؛ حتی کہ ہوا میں اڑنے والے پرندے بھی کامیابی نہیں پاسکتے۔

کامیابی کی پہلی منزل وہ ہے؛ جس کا نام قرآن کی بولی میں ایمان ہے۔ **الا الذین امنو** ۔تم جبھی کامیابی پاسکتے ہو جب تمہارے دلوں کے اندر اور روح وفکر میں وہ چیز پیدا ہو جائے جس کا نام قرآن کی زبان میں ایمان ہے، ایمان کے معنی عربی زبان میں زوال شک کے ہیں یعنی کامل درجہ کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں کے اندر پیدا نہ ہو اور اللہ کی صداقت وسچائی اور اللہ کے قوانین و اصولوں پر کامل یقین تمہارے قلوب میں موجزن نہ ہو جائے تب تک کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔

دوسری منزل اس کے بعد آتی ہے جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلو گے تو صرف پہلی منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پاسکتے۔ اس کا نام قرآن کی زبان میں عمل صالح ہے۔ **وعملوا الصلحت** ۔یعنی وہ کام جو اچھائی کے ساتھ کیا جائے؛ جس کام کو جس صحت اور جس طریقے کے ساتھ کرنا چاہیے اور جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہوسکتا ہے، اس کام کو اسی کے ساتھ انجام دیا جائے۔ اس سے سادہ تر الفاظ میں یہ کہ جو طریقہ اس کام کے انجام دینے کا صحیح طریقہ ہوسکتا ہے، اسے اسی طریقہ کے ساتھ انجام دیا جائے۔ قرآن کا یہ اصول تو عام ہے؛ کیوں کہ ایمان کے معنی ہیں وہ کامل یقین وکامل اطمینان اور اقرار جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔

تیسری منزل ہے توحید حق کی۔ **وتواصوا بالحق**۔یعنی ان منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گذرنے کے بعد تیسری منزل کو بھی کامیابی سے طے کرو یعنی دنیا میں خدا کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ۔ جب تک تم میں یہ بات نہ ہو کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے، تب تک تم کو کامیابی نہیں مل سکتی۔ اب اگر تیسری منزل کے لیے تیار ہو گئے۔ اگر توفیق الٰہی نے تمہاری دستگیری کی ہے اور تم نے یہ منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے کر لی ہے تو کیا پھر مقصود حاصل ہو جائے گا اور کچھ نہ کرنا پڑے گا۔ قرآن کہتا ہے، نہیں! بلکہ ایک اور آخری منزل بھی ہے جو کہ اعلان صبر کی منزل ہے۔ **وتواصو بالصبر** ۔اعلان صبر کی منزل اعلان حق کی منزل کے ساتھ لازم وملزوم کا رشتہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جاسکتی۔ فرمایا کہ حق کا وہ اعلان کریں گے، حق کا پیغام پہنچائیں گے، حق کا پیغام سنائیں گے، حق کی دعوت دیں گے، حق کی تبلیغ کریں گے۔ حق کا چیلنج کریں گے، حق کا پروپیگنڈا کریں گے؛ لیکن حق کا یہ حال ہے کہ حق کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا، جب تک قربانیوں کے لیے نہ اٹھے۔ حق کا پیغام پہنچانا بغیر قربانی و ایثار کے ایسا ہی ہے جیسا کہ آگ کو ہاتھ میں پکڑ لینا، بغیر اس کی گرمی کے۔ جیسے یہ ناممکن ہے، ویسے ہی وہ بھی محال ہے اس لیے چوتھی منزل صبر کی ہے، جب تک یہ منزل بھی طے نہ کی جائے کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔ اعلان صبر کی منزل اعلان حق کی منزل کے ساتھ لازم وملزوم کا رشتہ رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جاسکتی۔

☆☆☆